انسان نے آدمی بنایا
محمد مونس خان عظیمی
مکتبہ عظیمیہ لاہور

انسان نے آدمی بنایا

مونس خاں عظیمی

مکتبہ عظیمیہ اُردو بازار لاہور
برائے رابطہ: 158 مین بازار مزنگ لاہور
فون: 042-37243541

نام کتاب: انسان نے آدمی بنایا۔

مؤلف: مونس خاں عظیمیؔ

کمپوزنگ: منور ملک 0300-8076971

ناشر: مکتبہ عظیمیہ اُردو بازار لاہور

مطبع: اکبر ندیم پرنٹرز لاہور

قیمت: -/170 روپے

مکتبہ عظیمیہ اُردو بازار لاہور

برائے رابطہ: 158 مین بازار مزنگ، لاہور

فون: 042-37243541

انتساب

"اُس کھوج اور جستجو

کے نام

جو طرزِ فکر کو

روحانی بناتی

ہے۔"

فہرست مضامین

کچھ عرض ہے؟

مرشد کریم فرماتے ہیں کہ:

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنے لئے ''احسن الخالقین،، کہہ کر بیان کیا ہے کہ میں تخلیق کرنے والوں میں بہترین خالق ہوں یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے علاوہ بھی مخلوق کو تخلیق کی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ انسانی تخلیق اور اللہ کی تخلیق میں حدِ فاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وسائل کے بغیر جس چیز کو تخلیق کرنا چاہتے ہیں تو بس فرماتے ہیں ,,کن،، ہو جا۔ پس وہ ,,فیکون،، ہو جاتی ہے۔ جبکہ انسان کے اندر تخلیق کرنے کی جو صلاحیتیں کام کر رہی ہیں وہ وسائل کی محتاج ہیں۔

جب تک کوئی انسان ان تخلیقی صلاحیتوں کو زمان و مکان کی حد بندیوں سے آزاد رہ کر استعمال کرتا ہے وہ سب جنّت کی زندگی ہے اور جب کوئی انسان ان صلاحیتوں کو زمان و مکان کی حد بندیوں کے اندر اور وسائل کے اندر بند کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق یہ جہالت اور ظلم ہے۔

جس طرح عقل و شعور اور دانائی ایک درخت کی طرح پھلتی پھولتی ہے اُسی طرح ظلم و جہالت کے درخت پر بھی پھول پتے اور شاخیں اُگتی ہیں۔ لیکن چونکہ بنیاد ظلم اور جہالت پر ہوتی ہے اس لئے آدمی ان ساری ایجادات اور ترقیوں سے جو زمان و مکان یا وسائل کے اندر قید ہو کر کی گئی ہیں سے خوش ہونے کی بجائے ناخوش اور بے سکون ہو جاتا ہے اور غیر مطمئن زندگی گزارتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی روشنی میں جب ہم موجودہ سائنسی ترقیوں کی طرف نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس ترقی میں وہ تمام چیزیں ملتی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ظلم اور جہالت فرمایا ہے۔ آج کی ترقی پوری نوعِ انسانی کیلئے عذاب بن گئی ہے۔ کیونکہ ان ترقیوں کا نصب العین ذاتی مفاد ہے۔

میرے مرشد کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمیؔ مدظلہ العالیٰ فرماتے ہیں کہ ''جب انسان کسی خواہش کی تکمیل کو اپنا نصب العین بنالیتا ہے تو درحقیقت وہ اس کے تشخص کو اپنے اوپر مسلط کر لیتا ہے۔'' اگر انسان کا مطمعٔ نظر ذاتی مفاد ہے تو وہ جسمِ خاکی میں مقید ہو جاتا

ہے۔ جہاں تنگی ہے۔ گھٹن ہے۔ اندھیرا ہے۔ وہ اِس تشخص کے طول وعرض میں بند رہتا ہے۔ باہر نہیں نکل سکتا۔ تیرہ وتاریک قید خانہ میں بند قیدی کی طرح اس کا رابطہ وسیع و عریض رنگین دنیا سے باقی نہیں رہتا۔

اس کے برعکس اگر خواہشات کا مقصد اللہ یا نوعِ انسانی کا اجتماعی مفاد ہے تو وہ اس تاریک تشخص سے نکل کر روشن دنیا میں آ جاتا ہے۔ جس سے اس کی روح ہلکی پھلکی اور منور ہو جاتی ہے اور وہ قدرت کے اس چلن پر چلتے ہوئے کائنات کے اندر لامتناہی نظاموں سے بتدریج واقف ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ دیکھ لیتا ہے کہ یہ نظامِ قدرت کی کن صفات پر متحرک ہیں اور کیسے تخلیق در تخلیق ہو رہے ہیں۔ پھر وہ ان صفات سے واقف ہوتے ہوئے ذات سے واقف ہو جاتا ہے اور اسے وہ ذاتِ باری تعالیٰ لامتناہی صفات کے ساتھ پوری کائنات میں محیط نظر آتی ہے۔

جناب محمد مونس خاں عظیمی صاحب روحانی ڈائجسٹ کے ساتھ کافی عرصہ تک منسلک رہے اور اُس دوران اُنہوں نے روحانی ڈائجسٹ کے لئے بہت سی کہانیاں لکھیں۔ اُن کی تمام تحریروں کو ہم نے کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اُن کی یہ تحریر بھی روحانی ڈائجسٹ سے لے کر آپ سب خواتین وحضرات کی خدمت میں پیش کرنے کا شرف حاصل کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنّت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور اُن کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

دعا گو دعا جو:

میاں مشتاق احمد عظیمی

روحانی فرزند

حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی

مراقبہ ہال 158۔ مین بازار مزنگ لاہور

فون: 042-37243541

0300-4452866

تاریخ اشاعت: 25-06-2011

میں 'لا دین ہو گیا

میرا تعلق ہندوستان کے شہر بریلی سے ہے۔ مسلمانوں کی تحریکِ آزادی کے خلاف کام کرنے پر انگریز بہادر نے میرے اجداد کو بیش بہا دولت اور جائیداد عطا کی تھی۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہی جائیداد جو اپنے ہی ہم وطنوں کے گلے کٹا کر ملی تھی، آپس ہی میں لوگوں کے گلے کاٹنے لگی۔

سنتے ہیں کہ میرے والد صاحب بھی اس ہی جائیداد کی بھینٹ چڑھ گئے۔ کوئی کہتا تھا کہ انہیں سانپ نے ڈس لیا۔ کوئی بتاتا تھا کہ انہیں زہر دیا گیا تھا۔

بہر حال، جب میں پانچ برس کا تھا تو وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

اب تمام جائیداد کے وارث میرے دو چچا تھے۔ میرے یہ دونوں چچا والد کا حصہ پوری ایمانداری سے ادا کرتے تھے لیکن ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ جائیداد کا یہ وارث کسی نہ کسی طریقے سے ختم ہو جائے۔

میری والدہ کو بھی ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی تھی کہ نہ جانے کب ان کے دیوران پر اور ان کی اولاد پر وار کر جائیں۔ اس اندیشہ کے پیشِ نظر والدہ نے اپنے بھائی کو پاس بلا کر رکھ لیا تھا۔ ان کا سارا خرچ والدہ ہی برداشت کرتی تھیں۔ میرے یہ ماموں کام کاج کچھ نہیں کرتے تھے۔ ان کا زیادہ سے زیادہ وقت اپنی نوجوان بیوی

کے ساتھ خوش گپیوں میں گزرتا تھا۔

دولت کی ریل پیل دیکھ کر ماموں کی نیت بدل گئی اور انہوں نے والدہ کو چچاؤں کی جانب سے زیادہ بدگمان کرنا شروع کر دیا۔ اور پھر ایک رات جب کہ دونوں چچا گھر پر موجود نہیں تھے، میری والدہ نے ایک ماہر راہزن کی طرح سونا اور روپیہ اکٹھا کیا اور خاموشی کے ساتھ اپنے بھائی کے ہمراہ نکل کھڑی ہوئیں۔

اس زمانے میں تحریک آزادی زوروں پر تھی۔ ہر طرف جلسے جلوس اور پکڑ دھکڑ کا سلسلہ چل رہا تھا۔ میری والدہ اپنے بھائی کے ہمراہ بمبئی آ گئیں۔ ان کے پاس بے انتہا روپیہ پیسہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے ماڑواڑی کی ایک بلڈنگ خرید لی۔

ماموں چونکہ تعلیم و ہنر سے بے بہرہ تھے اس لئے دن بھر سیر و تفریح کے علاوہ ان کا کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ پھر نہ جانے انہیں کیا سوجھی کہ وہ بھی ایک رات ممانی کو ساتھ لے کر کہیں غائب ہو گئے۔ انہوں نے چلتے چلتے [illegible] والدہ کا زیور چھوڑ گئے اور باقی تمام دولت ساتھ لے گئے۔ شاید انہیں یتیم بھانجے اور بیوہ بہن پر رحم آ گیا تھا۔ ذرا اس وقت کے حالات پر غور کیجئے جب چاروں طرف خوف و ہراس کی فضا قائم تھی اور کسی بھی شخص کی نہ جان محفوظ تھی، نہ اس کا مال۔ میری والدہ نے تنہا حالات کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے اپنے تمام زیورات فروخت کر دیئے۔ اس طرح ان کے پاس ڈیڑھ لاکھ روپے جمع ہو گئے۔ معاش کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد انہوں نے ساری توجہ میری تعلیم پر صرف کرنا شروع کر دی۔ ان کی امیدوں کا آخری چراغ میں ہی تھا۔

پھر جب میں آٹھویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ ایک دن گھر میں چند

مہمانوں کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ میرے ماموں برسہا برس کے بعد اپنی بہن سے ملنے آئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی اور میری ہم عمر چاندسی لڑکی شمی بھی تھی۔

ماموں یہاں سے بھاگ کر سعودی عرب چلے گئے تھے۔ ریاض میں وہ دو بڑے بڑے جنرل اسٹورز کے مالک تھے۔ طائف شہر میں ان کا ایک عالیشان مکان تھا ان کے پاس آسائش کی ہر چیز موجود تھی۔

شمی چونکہ وہیں پیدا ہوئی تھی لہٰذا عربی زبان روانی سے بولتی تھی۔ البتہ اردو اٹک اٹک کر بولتی تھی اور اردو بولتے وقت اس کا لہجہ بڑا ہی پیارا لگتا تھا۔

ماموں میری ماں کو لینے آئے تھے۔ لیکن میری ماں نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تم نے بھائی ہو کر مجھے اپنے وطن میں دھوکا دیا تو تمہارا اب کس طرح اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ درحقیقت بھائی کے اوپر سے بہن کا اعتبار اٹھ چکا تھا۔

ماموں اپنے کئے پر پشیمان تھے لیکن ان کا کہنا تھا کہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو آج دولت مند نہیں بن سکتے تھے۔ پھر اس وقت حالات ایسے تھے کہ وہ بیوہ بہن کو ساتھ لئے لئے کہاں پھرتے۔ لہٰذا انہوں نے تنہا ہی جدوجہد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

بہرحال، والدہ کسی بھی طور سے جانے کو راضی نہ ہوئیں۔ آخر میں انہوں نے میری تعلیم کا ایسا بہانہ تراشا کہ ماموں کا کچھ بس نہ چل سکا۔ دراصل ماموں بھی یہی چاہتے تھے کہ میں زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کروں کیونکہ وہ مستقبل میں مجھے اپنے کاروبار کا مالک بنانا چاہتے تھے۔

والدہ نے ان سے وعدہ کر لیا کہ میری تعلیم ختم ہوتے ہی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے

لئے سعودی عرب آ جائیں گی۔ والدہ کا خیال تھا کہ اس وقت تک میں جوان ہو چکا ہوں گا اور ہر قسم کے اچھے برے حالات کا مقابلہ کر سکوں گا۔

ماموں نے اپنی غلطی کے کفارے میں شمی سے میری نسبت طے کر دی اور بیس دن ٹھہرنے کے بعد ڈھیروں سامان اور تقریباً دس ہزار روپے چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ شمی نے جہاں مجھے بہت سارے کھلونے دیئے تھے، وہیں ایک خوبصورت سا البم بھی دیا تھا۔

میں اکثر اس البم کو دیکھا کرتا تھا۔ جس میں ماموں اور ممانی اور شمی نے مقاماتِ مقدسہ کے پس منظر میں کھڑے ہو کر فوٹو کھنچوائے تھے۔ اس البم میں چند فوٹو تنہا شمی کے بھی تھے۔ وہ اپنے گھر کے کسی سجے سجائے کمرے میں بیٹھی کھلونے سے کھیل رہی تھی یا پھر پڑھ رہی تھی۔ میرا جب بھی دل گھبراتا الماری سے البم نکالتا اور دیکھنے بیٹھ جاتا۔ اس طرح رفتہ رفتہ شمی میرے دل میں اترتی گئی اور وہ تصویروں میں مجھے بہت اچھی لگنے لگی اور چاہت کا جذبہ بڑھتا رہا۔

یہاں سے جانے کے بعد ماموں نے والدہ سے رابطہ قائم رکھا۔ وہ ہر تین چار ماہ کے بعد تین چار ہزار روپے بھیج دیا کرتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ میں فکروں سے آزاد ہو کر تعلیم حاصل کروں۔

میں نے میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ یہ دن میرے اور میری والدہ کے لئے نہایت ہی خوشی کا دن تھا۔ انہوں نے سعودی عرب بذریعہ ٹیلیگرام اپنے بھائی کو خبر دی دوسرے دن مبارک باد کے دو ٹیلیگرام موصول ہوئے۔ ان میں ایک شمی کا بھی تھا۔ پھر میں نے اسے مبارک باد کے جواب میں شکریہ کا خط لکھا۔ اور

بس، یہیں سے ہماری قلمی دوستی شروع ہو گئی۔

خدا جانے ماموں کو اس کا علم تھا کہ نہیں، بہر حال میری والدہ اس بات سے آگاہ تھیں۔ اس کا اندازہ مجھے اس طرح ہوا کہ جب کبھی میرے نام سے خط آتا تھا تو وہ کھولتی نہیں تھیں بلکہ پڑھنے والی میز پر رکھ دیا کرتی تھیں۔

شمی نے مجھے ایک تازہ فوٹو بھی بھیجا تھا۔ یہ بڑا ہی دلکش فوٹو تھا۔ وہ احرام پہنے کوہ منا پر کھڑی تھی۔ اب وہ ایک نہایت حسین و جمیل معصوم دوشیزہ تھی۔

مذہب سے میرا لگاؤ صرف روزہ اور نماز کی حد تک تھا اور وہ بھی صرف جمعہ کی نماز تک۔ قرآن یا تو ثواب کی خاطر رمضان المبارک میں پڑھا کرتا تھا یا پھر کسی مرنے والے کی بخشش کی خاطر تلاوت کیا کرتا تھا۔

انٹر میں کیمسٹری بھی میرے مضامین میں شامل تھی جس میں مادہ کے بارے میں وضاحت کی گئی تھی۔ پھر کالج میں لادینی عناصر کا ایک حلقہ بھی میسر آ گیا جن کے خیال میں مذہب کے بجائے مادہ پرستوں نے انسانیت کی زیادہ خدمت کی ہے۔

ان کا کہنا تھا کہ بجلی کے موجد ایڈیسن نے انسانیت کی جتنی خدمت کی ہے، کسی پیغمبر نے نہیں کی۔ (نعوذ باللہ) اسی طرح وہ ٹیلیفون کے موجد گراہم بیلی اور ریڈیو کے موجد مارکونی کو خراج تحسین پیش کیا کرتے تھے۔ میں شروع میں دینی حمیت کے سہارے الجھتا رہا لیکن ان کے دلائل کے سامنے میرا بس نہیں چلتا تھا۔ کیونکہ میرے ذہن میں دین واضح نہیں تھا۔ قرآن کو نہ تو میں نے سمجھا تھا اور نہ ہی کوئی مجھے سمجھانے والا ملا تھا۔ قرآن کو میں نہایت ہی مقدس کتاب سمجھتا تھا، ایک ایسی کتاب

جس کا ایک ایک حرف قابل تعظیم ہے، جس کو خداوند کریم نے اپنے محبوب نبی ﷺ پر نازل کیا ہے، جس کا پڑھنا کارِ ثواب ہے اور بس۔

اب مادہ پرستوں نے میرے ذہن کا گھیراؤ اس طرح کرلیا تھا کہ مجھے ان کے نرغے سے نکلنے کی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔

میرا ناپختہ ذہن، دین سے نابلد دماغ اور اسلام کی حقیقتوں سے خالی دل جلد ہی ان کا گرویدہ ہوگیا۔ پھر جب شعور ذرا بیدار ہوا تو مختلف الخیال مسلمان ساتھیوں سے واسطہ پڑا اور یہ بات سامنے آئی کہ مسلمان کئی فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ مذہب کی بنیادی باتوں کو مانتے ہوئے بھی لوگوں نے جدا جدا مسلک قائم کرلئے تھے اور ہر مسلک کے لوگ اپنے عقیدے کے متعلق ایسی ایسی دلیلیں پیش کرتے تھے کہ سننے والا تردید نہیں کرسکتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب ہمارا خدا ایک ہے، نبی ایک ہے، قرآن ایک ہے، کعبہ ایک ہے تو پھر جدا جدا مسلک کیوں ہیں؟ یہ ایک ایسی صورت حال تھی جس میں اگر کوئی کافر بھی مسلمان ہونا چاہے تو اسے سب سے پہلے یہ تعین کرنا پڑتا کہ وہ مسلمان کس مسلک کے تحت ہو رہا ہے کیوں کہ ہر شخص اپنے مسلک کو درست مان کر قربِ الٰہی کا دعویدار اور جنت کا حقدار بنا بیٹھا تھا۔

جنگ عظیم میں انسانی خون جس بے دردی سے بہا اس نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا کہ انسان انسان کا دشمن کیوں ہے۔ اگر دنیا کے تمام مذاہب پیار و محبت کا درس دیتے ہیں تو پھر ہیروشما اور ناگاساکی پر ایٹم بم کیوں گرائے گئے۔ نہیں، نہیں یہ سب بکواس ہے۔ انسان صرف انسان ہے۔ امن اور سلامتی کا رسیا۔ صرف مذہب اسے خونی اور قاتل بنا دیتا ہے۔ مذہب نے انسان کو فرقوں میں بانٹ دیا ہے اور وہ

صرف مذہبی برتری قائم رکھنے کی خاطر دوسروں کی جان کا دشمن بن جاتا ہے مذہب کے بارے میں میرے خیالات بدلنے لگے۔ میں اس بارے میں جتنا غور کرتا، مذہب سے بددل ہوتا چلا جاتا۔ اور اب میرے لئے مذہب کی کوئی حیثیت نہیں رہی کیونکہ جنت و دوزخ کا فیصلہ اپنے اعمال پر تھا۔ لیکن بعض لوگوں نے اعمال کے بجائے نہ جانے کن کن وسیلوں کو بخشش کا ذریعہ بنالیا تھا۔ ان مذہبی گتھیوں کو سلجھانے کے بجائے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ میں دین سے بے تعلق ہو جاؤں۔

انٹر کا امتحان دینے کے بعد میں نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا، شمی نے نہایت پیار بھرا خط لکھا تھا۔ اس نے حرم شریف میں جا کر میرے پاس ہونے کی دعا مانگی تھی۔ میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ میں مذہب کا قائل نہیں ہوں۔ میں پاس ہونگا تو اپنی محنت سے پاس ہوں گا۔ اگر تمہیں اپنے اللہ پر اتنا ہی اعتماد ہے تو آئندہ میں بے پڑھے امتحان دوں گا۔ تم اپنے اللہ سے دعا کرا کے پاس کرا دینا۔

میرے اس خط کا جواب جلد ہی آ گیا۔ جواب نہایت ہی سادہ تھا۔ اس نے لکھا تھا ''تم وہاں کیا کر رہے ہو۔ تفریح کی غرض سے ہی والدہ کو لے کر یہاں آجاؤ۔''

بات معقول تھی۔ میں نے سوچا کے دن کافی ہیں نتیجہ نکلنے میں، کیوں نہ اسی بہانے شمی کی قربت میں کچھ دن گزار لئے جائیں۔

میں نے اپنے اور والدہ کے پاسپورٹ کے لئے بھاگ دوڑ شروع کردی۔ والدہ بھی خوش تھیں کہ وہ نہ صرف اپنے بھائی سے ملیں گی بلکہ عمرہ کی سعادت بھی حاصل کرلیں گی۔

پاسپورٹ کے حصول کی خاطر والدہ کو بھی کئی بار مختلف دفاتر میں جانا پڑا جس سے ان کی صحت بری طرح متاثر ہونے لگی۔ انہیں کبھی کھانسی ہوجاتی اور کبھی نمونیہ ہوجاتا۔ میں ان کی طرف سے پریشان رہنے لگا۔ میں نے انہیں کئی ڈاکٹروں کو دکھایا لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ اور پھر ایک دن وہ مجھے تنہا چھوڑ کر اس دنیا میں چلی گئیں جس کو مذہبی لوگ آخرت کی زندگی کہتے ہیں۔

تدفین سے فارغ ہو کر میں نے ماموں کو اطلاع دی جواب میں انہوں نے لکھا کہ تمام سامان فروخت کر کے فوراً سعودی عرب آجاؤ۔ ویسے بھی اب تنہا رہنا میرے بس سے باہر تھا۔ میں نے سامان فروخت کر کے مستقل طور سے سعودی عرب جانے کی تیاریاں شروع کردیں۔

اب مجھے دن اور تاریخ تو یاد نہیں، البتہ جب گھر سے روانہ ہوا تو صبح کا وقت تھا۔ دو روز پہلے جو طوفان بادوباراں بمبئی پر نازل ہوا تھا اس کے اثرات ابھی تک موجود تھے۔ گلیوں اور سڑکوں پر جا بجا پانی کھڑا ہوا تھا۔ جب میں جٹی پر پہنچا تو وہاں زبردست گہما گہمی تھی۔ سینکڑوں مسافر جو یونانی جہاز پر سوار ہونے والے تھے، اپنے دوستوں، رشتہ داروں اور عزیزوں سے سلام و دعا کر رہے تھے۔ قلیوں کی بھاگ دوڑ، موٹروں کے ہارن بجنے کی آوازیں، سامان کی ریل پیل اور ایک دوسرے کو پکارنے کی آوازیں ___ غرض کہ بڑا ہی دلچسپ سماں تھا۔

بندرگاہ پر پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی موٹر لانچیں مسافروں کو بھر بھر کر دور سمندر میں کھڑے ہوئے یونانی جہاز پر پہنچانے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ لانچ بھی آگئی جس میں مجھے سوار ہونا تھا۔ میرے علاوہ جو مسافر اس میں سوار ہوئے ان کے ساتھ

خواتین بھی تھیں۔ چند مسلمان خواتین لمبے برقعوں میں لپٹی ہوئی تھیں، بعض جو یورپین تھیں انہوں نے پنڈلیوں سے اوپر اسکرٹ پہن رکھے تھے۔ اور چند ایسی خواتین بھی تھیں جنہوں نے ساڑھیاں باندھ رکھی تھیں۔

لانچ کے روانہ ہوتے ہی بندرگاہ پر کھڑے ہوئے لوگوں نے رومال ہلا ہلا کر اپنے رشتہ داروں کو الوداعی سلام کیا۔ مجھے پہلی بار اکیلے ہونے کا احساس ہوا۔ مجھے رخصت کرنے کوئی نہیں آیا تھا۔ بلکہ میں تو خود یہاں سے رخصت ہو رہا تھا، اس زمین سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جا رہا تھا جہاں میں پیدا ہوا تھا، جہاں میرا خاندان آباد تھا۔ اس زمین سے میرا بچپن وابستہ تھا۔ میرے دل میں غم کی ایک لہر سی اٹھی۔ کیا میں پھر واپس آسکوں گا، میں نے سوچا، اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں میں نمی آگئی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا ''الوداع، اے مادرِ وطن ہند! الوداع!''

یونانی جہاز ساحل سے تقریباً دو میل دور کھڑا تھا۔ تیز اور روشن دھوپ میں وہ ایک سیپ کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ یہ جہاز ہانگ کانگ اور سنگاپور سے ہوتا ہوا بمبئی پہنچا تھا۔ اور اب یہاں سے مسافروں کو لیتا ہوا اسے سعودی عرب اور پھر واپس یونان پہنچنا تھا۔

ہماری لانچ جوں جوں آگے بڑھ رہی تھی، جہاز نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔ یہ میری زندگی کا پہلا بحری سفر تھا۔ جہاز اگرچہ کافی بڑا نہیں تھا لیکن اس کی خوبی یہ تھی کہ دور سے وہ بڑا دکھائی دے رہا تھا۔

میرا اندازہ ہے کہ اس کی لمبائی ایک سو ساٹھ فٹ سے زیادہ اور وزن سات آٹھ ہزار ٹن تک ہوگا۔ اس کی بناوٹ بالکل اس طرح تھی جیسے تربوز کی بڑی سی قاش

کاٹ کر سمندر میں رکھ دی گئی ہو۔ پھر نیچے سے اوپر تین منزلیں اس طرح سے قائم تھیں جیسے سیڑھیاں ہوتی ہیں اور ہر منزل کا رنگ جدا اور شوخ تھا۔ باہر سے بھی یہ بناوٹ اور رنگ روپ کی وجہ سے بڑا خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔

جہاز کے کٹہرے کے ساتھ ساتھ ہم سے پہلے پہنچنے والے مسافر کھڑے تھے۔ ان میں بچے، بوڑھے جوان سب ہی دلچسپی سے آنے والے مسافروں کو دیکھ رہے تھے۔

گینگ وے پر ایک چاق وچوبند پولیس افسر نے تمام مسافروں کے سفری کاغذات اور ٹکٹ وغیرہ دیکھے اور مطمئن ہو کر جہاز میں داخل ہونے کی اجازت دے دی۔ برج ڈیک کے دائیں کیبن نمبر ۱۶ مجھے دیا گیا۔ اس کیبن میں یوں تو دو آدمیوں کی گنجائش بھی تھی اور میرا خیال تھا کہ جلد ہی دوسرا مسافر بھی آجائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں نے اپنا سامان رکھا اور پھر جہاز کی سیر کرنے کے لئے باہر آگیا۔
جہاز کی اندرونی بناوٹ، سجاوٹ خوبصورتی، زیبائش اور سامان آرائش دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کسی چھوٹے سے شہر میں آگیا ہوں۔

برآمدے کے ساتھ ساتھ کھلے عرشہ کی آخری حصے پر لکڑی کے تختوں کی ایک دیوار سی کھڑی تھی جب میں جہاز کی سیر کرتا ہوا اس دیوار کے قریب پہنچا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ پوری دیوار نہایت دل کش اور معنی خیز تصویروں سے مزین تھی ______ آسمان پر کالی گھٹائیں، ہوا کا طوفان، بجلی کی چمک اور ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔ اس قیامت خیز طوفان میں صدیوں پرانا ایک جہاز ہچکولے کھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ جہاز کے بادبان پھٹ چکے تھے اور مستول ٹوٹے ہوئے تھے۔

یوں معلوم ہوتا تھا کہ سمندر کی خوفناک موجیں بس اسے نگلنے کو ہیں۔ لیکن اس ہی طوفان بلاخیز میں دور آسمان پر کالی گھٹاؤں میں سے یونانی دیو مالائی کہانیوں کے لاثانی کردار ہرکولیس کو جھانکتے دکھایا گیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ جہاز کی جانب اس انداز میں بڑھے ہوئے تھے جیسے وہ سمندر کے اس طوفان کو روک رہا ہو۔

میں کچھ دیر اس تصویر کو دیکھتا رہا۔ شاید یہ تصویر جہاز کو کسی غیر متوقع حادثہ پیش آجانے کی صورت میں مسافروں کے لئے تقویت کا باعث ہو سکتی ہو۔ اس دیوار کی دوسری جانب پہلا درجہ شروع ہو جاتا تھا۔ دوسرے درجے کے مسافر وہاں نہیں جا سکتے تھے۔ اس حصہ میں مسافروں کے ساتھ ساتھ جہاز کے اعلیٰ افسروں کے کیبن بھی تھے۔ اور ان کیبنوں کے اوپر جہاز کے کپتان کی رہائش گاہ تھی جہاں تک پہنچنے کے لئے نہایت چمک دار اور خوبصورت سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ قریب ہی دو لائف بوٹس کے سیٹ رسیوں سے لٹک رہے تھے۔ اول اور دوئم درجے کے مسافروں کی تعداد پچاس سے زیادہ ہوگی۔

میں اول اور دوئم درجے کی سیر کرتا ہوا آخری درجے پر آگیا۔ اس آخری درجے کے عرشے پر بڑی ہی رونق تھی۔ ان مسافروں کی تعداد سات آٹھ سو سے زیادہ ہوگی۔ ان کا سامان نہایت ہی بے ترتیبی سے بکھرا ہوا تھا۔ جس کو جہاں جگہ ملی وہیں بیٹھ گیا۔ ان میں کم درجہ کے مزدور اور ملازم پیشہ لوگ تھے جو بمبئی کی مختلف چھوٹی چھوٹی فیکٹریوں میں کام کرتے تھے ان میں مختلف مذاہب کے لوگ شامل تھے...... مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی اور اینگلو انڈین وغیرہ۔

اس عرشہ پر طرح طرح کی بولیوں سے ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ ان مسافروں میں ان مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی جو ہندوستان کو خیرباد کہہ کر ہمیشہ کے لئے پاکستان جارہے تھے، اگرچہ اس وقت پاکستان معرض وجود میں نہیں آیا تھا۔ لوگوں کے ذہنوں میں تصور پاکستان تھا اور انگریز حکومت کے سامنے تجویز پاکستان پیش کی جاچکی تھی۔ اس کے غیر مصدقہ جغرافیائی حدود بمبئی کے ساحل کے ساتھ ساتھ کراچی تک پہنچتے تھے۔ وہ سب اردو اور پنجابی میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ ہر شخص جان پہچان کے بغیر ہی ایک دوسرے کی خیریت پوچھتا پھر رہا تھا۔ اور لوگ اپنے اپنے حالات کھلے دل کے ساتھ سنا رہے تھے۔ اس وقت ان سب کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا کہ یہ سب ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔

میں نے چند لوگوں کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے شاید ان کے ہم وطنوں نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر بنگالی مسلمان نے بتایا کہ اس کی خوبصورت بیوی کو بلوائیوں نے اس کے سامنے بکرے کی طرح ذبح کر دیا۔ اور بڑی مشکل سے اپنی نوجوان لڑکی کو بچا کر لایا ہے۔ میں نے اس لڑکی کو بھی دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک خوف نمایاں تھا۔ وہ میری جانب سہمی سہمی نظروں سے اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے میں بھی انسان نہیں کوئی درندہ ہوں جو موقع پاتے ہی اس پر جھپٹ پڑے گا۔ اسے لوٹنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن ماں نے اپنی جان دے کر بیٹی کی عزت کو بچالیا تھا۔ بیٹی زندہ تھی، محفوظ تھی، خوف زدہ خوف زدہ سی۔ ''یہ کیسی زندگی ہے'' اس نے لمحہ بھر کو سوچا۔ ''انسان درندہ کیوں بن جاتا ہے!''

خوف زدہ لڑکی کے باپ نے بتایا کہ وہ جس شہر میں رہتا تھا، وہاں شاید ہی

کسی مسلمان کا گھر محفوظ رہا ہوگا عیسائی۔۔۔ ہندو۔۔۔ مسلمان۔۔۔ مذاہب کا یہ تضاد ایک ساتھ پھر میرے ذہن کو پراگندہ کر گیا۔

''مذہب نے انسان کو انسان کا دشمن بنا دیا ہے'' میں نے سوچا، ''یہ مذاہب ہی ان فسادوں کی جڑ ہیں۔'' میں نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا اور اس بوڑھے کے پاس سے ہٹ کر دوسری جانب بڑھ گیا۔

مسلمان عورتیں برقعوں میں ملبوس اپنے ٹرنکوں اور صندوقوں کے پیچھے اس طرح سے بیٹھی تھیں جیسے انہیں چہار دیواری میسر آگئی ہو۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے عرشہ پر دوڑتے پھر رہے تھے۔ سیڑھیوں اور برآمدوں سے گزرتے وقت میں نے بہت سے نقشے اور تصویریں بھی وہاں آویزاں دیکھیں۔ ان میں سفر کے دوران آنے والی تکلیفوں کا ذکر اور ان کے سدِ باب کا طریقہ درج تھا۔ چند دیواروں پر مختلف زبانوں میں ہدایات بھی کندہ تھیں جن میں بتایا گیا تھا کہ خطرہ کے وقت مسافر حفاظتی کشتیوں میں کس طرح سوار ہوں۔ جہاز سے نکلنے کے لئے کون کون سے راستوں پر جائیں۔ لائف جیکٹ پہننے کا طریقہ کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

میں ان ہدایات پر سرسری سی نظر ڈالتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ لیکن ایک راہداری کی سیڑھیاں اترتے وقت میری نگاہ گہرے سرخ رنگ سے لکھے ہوئے ان موٹے الفاظ پر پڑی اور میں چونک کر کھڑا ہو گیا۔

دراصل یہ ایک پوری عبارت تھی جس کا آخری فقرہ خاص طور سے نمایاں کرنے کے لئے گہرے سرخ رنگ سے لکھا گیا تھا۔ فقرہ کچھ اس طرح تھا:

''اگر سمندر میں جہاز کو آگ لگ جائے تو یہ حادثہ خطرناک ہو سکتا ہے۔''

اس جملے کو پڑھ کر میں نے اپنی طبیعت میں کچھ اضطراب سا محسوس کیا۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ اگر آگ لگ جائے تو یہ حادثہ خطرناک ہو سکتا ہے جب کہ ہمارے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔

''ہونہہ! یہ نہایت ہی احمقانہ وارننگ ہے۔''

میں دل ہی دل میں مسکرایا اور آگے بڑھ گیا۔ اس راہداری کو عبور کرنے کے بعد میں ڈسپنسری کی طرف نکل آیا۔ یہ جہاز کے آخری سرے پر دائیں جانب واقع تھی۔ اس چھوٹے سے اسپتال میں تین ڈاکٹر اور آٹھ نرسیں کام کرتی تھیں۔ اس وقت ایک ڈاکٹر دو نرسوں کے درمیان کھڑا سمندر کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر اور دونوں نرسیں رنگ اور لباس سے یورپین لگ رہے تھے۔ ان ہی میں ایک سنہرے بالوں والی نرس بھی تھی۔ ان کے قریب سے گزرتے وقت میں نے سنہرے بالوں والی نرس کو ذرا غور سے دیکھا۔ وہ بھی میری طرف دیکھ کر مسکرائی وہ مجھے بہت ہی بھلی معلوم ہوئی ـــــ لیکن یہ مسکراہٹیں تو اجنبیوں کے درمیان سلام و دعا ہوتی ہیں۔ میں اور آگے بڑھ گیا۔ اس حسین چہرہ کو دیکھ کر ایک بار پھر میری طبیعت میں اضطراب پیدا ہوا۔ میں نے سوچا۔ ''اتنے حسین چہرے اس جہاز پر موجود ہیں۔ اگر واقعی آگ لگ جائے یا کوئی اور حادثہ پیش آجائے تو کیا ہوگا!''

اب جہاز کی سیر کے دوران میری نگاہیں حفاظتی سامان کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ جہاز پر ۱۶ لائف بوٹس موجود ہیں جن میں سے ہر لائف بوٹ میں تقریباً پچاس سے ستر آدمیوں تک کے سما جانے کی گنجائش تھی۔ ان کے علاوہ چھوٹی چھوٹی اور بھی بہت سی کشتیاں جہاز کے ساتھ لٹک رہی

تھیں۔ ان میں بیک وقت دس سے پندرہ آدمی بیٹھ سکتے تھے۔

جہاز کا کپتان اور اس کے عملے کے خاص افراد یونانی تھے۔ باقی تمام اسٹاف مختلف ملکوں سے تعلق رکھتا تھا۔ خلاصی وغیرہ ہندوستان کے ساحلی علاقوں کے باشندے تھے۔ ان کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ وہ اپنی نیلی وردیاں پہنے جہاز میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھاگتے پھر رہے تھے اور مختلف انتظامات میں مصروف تھے۔

میں جہاز کے آخری عرشے پر کٹہرے سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔ دور ـــ بہت دور ساحل نظر آرہا تھا۔ جہاز نے روانگی کا سائرن بجایا۔ پھر لنگر اٹھا لیا گیا۔ اور جہاز نے مشرق کی سمت رینگنا شروع کر دیا۔ لمحہ بہ لمحہ ساحل میری نظروں سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ افق پر سورج تھال کی مانند سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں خنکی بڑھنے لگی اور ہوا تیز چلنے لگی۔ اول اور دوسرے درجوں کے مسافر ٹھنڈی ہوا سے بچنے کی خاطر اپنے اپنے کیبنوں میں چلے گئے۔ عرشہ ویران ہو گیا۔ میں نے بھی اپنے کیبن میں جانا مناسب سمجھا۔ میرے سامنے والے کیبن میں ایک ہندوستانی نوجوان اپنی بیس سالہ نہایت ہی حسین و جمیل بیوی کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ وہ مدھیہ پردیش کا رہنے والا تھا اور مشرق وسطیٰ کے ایک ملک میں بحیثیت پٹرول انجینئر ملازم تھا۔ کچھ دنوں قبل وہ رخصت پر ہندوستان آیا تھا اور اب ملازمت پر واپس جا رہا تھا۔ اس کی بیوی کی گود میں چھ ماہ کی بچی تھی۔ اس نوجوان کا نام وشگی تھا۔ وہ امریکی لہجے میں نہایت تیزی سے اردو بولتا تھا۔ وشگی جلد ہی مجھ سے بے تکلف ہو گیا۔ وہ ہندو مذہب سے تعلق رکھتا تھا اور اس کا یہ تعلق بھی محض دکھاوے کا

تھا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ وہ میری ہی طرح لادین اور مادہ پرست واقع ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس کی شریک حیات زمانہ طالب علمی کی دوست تھی۔ دونوں کی دوستی اتنی گہری تھی کہ بالآخر دونوں نے زندگی ساتھ نبھانے کا فیصلہ کرلیا۔ وشگی اپنی بیوی کو اپنے ماں باپ سے ملانے کے لئے ہندوستان لایا تھا۔ اس نے شادی امریکہ میں کی تھی اور شادی کو دوسال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ جب میں نے اس کی شادی بارے میں زیادہ کریدا تو اس نے بتایا کہ شروع میں ماں باپ اس کی شادی سے ناراض تھے۔ وہ اپنے خاندان کی کسی لڑکی سے اس کی شادی کرنا چاہتے تھے لیکن جب وشگی نے اپنی مرضی سے شادی کرلی تو وہ ناراض ہوگئے۔ وشگی اپنی پسند کی شریک حیات کے ساتھ پرسکون زندگی گزارتا رہا۔ آخر ماں باپ کو اس کا فیصلہ قبول کرنا پڑا اور وہ اپنی بہو سے ملنے کے لئے راضی ہوگئے۔ وشگی نے انہیں سمجھایا کہ زندگی اسے گزارنا ہے لہٰذا شریک حیات منتخب کرنے کا حق بھی اسی کو ہونا چاہیئے۔ اس کی یہ دلیل ایسی تھی جسے ماں باپ کو ماننا پڑا۔ اس سفر کے دوران میں نے وشگی اور اس کی بیوی کے درمیان سچا پیار دیکھا۔ وہ دونوں واقعی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ ''انسان کو اپنی زندگی کا ساتھی چننے کا حق ہونا چاہیے'' میں نے تنہائی میں سوچا۔ اور پھر پرانی روایات پر غور کرنے لگا جہاں ماں باپ کی پسند سے شریکِ حیات کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ میرا انتخاب بھی میری ماں کی پسند سے ہوا تھا۔ کیا شمی مجھ سے پیار کرسکے گی، کیا ہم دونوں بھی اسی طرح کی پیار بھری زندگی گزار سکیں گے؟

یہ سوچتے سوچتے میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

☆☆☆

قادوس' موت کا پیامبر

اس سفر کے دوران میری ملاقات چیف پیٹی افسر رمنا سے بھی ہوئی۔ وہ نہایت ہی چاق و چوبند اور ہنس مکھ نوجوان تھا۔ جہاز کے تمام خلاصی اور نچلے درجے کے مسافر اس کے زیر نگرانی کام کرتے تھے۔

وہ رہنے والا تو یونان کا تھا لیکن اس کی ابتدائی پرورش اور تعلیم کینیڈا میں ہوئی تھی۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد وہ واپس اپنے ملک چلا گیا تھا۔ اور وہیں سے اس جہاز پر ملازم ہوگیا تھا۔ تقریباً دوسال پہلے جب اس کا جہاز افریقہ کے ساحل کے قریب سے گزر رہا تھا تو ان لوگوں نے مچھیروں کے ایک اسٹیمر کو ڈوبنے سے بچایا تھا۔ وہ اسٹیمر اسٹریلوی خاتون لُوما اور اس کی بیٹی کا تھا۔ راجیشی نہایت ہی حسین و جمیل دوشیزہ تھی۔ رمنا اسے دل دے بیٹھا۔ دونوں ایک دوسرے سے پیار کرنے لگے۔ پھر ابھی وہ برِ اعظم افریقہ کے گرد ہی چکر کاٹ رہے تھے کہ ایک رات لوما کے کیبن کی کھڑکی میں ایک سمندری پرندہ آکر بیٹھا۔ لوما اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی اور پھر دوسری صبح وہ مر گئی۔

افریقہ کے مچھیروں میں یہ بات برسہا برس سے مشہور ہے کہ سمندری پرندہ موت کا پیامبر ہوتا ہے۔ لُوما مر گئی اور راجیشی تنہا رہ گئی۔ پھر جب جہاز ایک بندرگاہ پر

رکا اور کپتان نے اسے جہاز سے اترنے کو کہا تو اس نے صاف انکار کردیا۔ اور رمنا کے بازو سے لپٹ کر کھڑی ہوگئی۔ اسکی آنکھوں میں آنسو تھے، پیار تھا، التجا تھی۔ کپتان نے رمنا کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا اور دونوں کی مرضی دیکھ کر جہاز پر ہی رہنے کی اجازت دے دی۔ اور تب سے وہ دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے ازدواجی زندگی بسر کررہے تھے۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ کچھ ہی عرصہ قبل راجیشی نے ہندو مذہب اختیار کرلیا تھا حالانکہ پیدائشی طور پر وہ کیتھولک عیسائی تھی۔ اس کے مذہب تبدیل کرنے پر رمنا کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ خود اپنے آبائی مذہب عیسائیت پر قائم تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ انسان جس مذہب کو اچھا سمجھے اسے اس مذہب کے تحت زندگی گزارنے کا حق ہونا چاہیئے۔

درحقیقت راجیشی کی ماں کی بے وقت موت نے اسے بے چین کردیا تھا۔ اور جب اسے ہندودھرم کے ذریعے فلسفہ آواگون کا علم ہوا تو وہ سختی سے اس عقیدہ کی قائل ہوگئی اس کے ذہن نے اس بات کو اچھی طرح قبول کرلیا کہ انسان مرتا نہیں ہے بلکہ ایک بعد دوسرا جنم لیتا رہتا ہے اور اس طرح انسانی گناہوں کی تلافی ہوتی رہتی ہے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ مذہب اور عقیدہ جدا جدا ہونے کے باوجود دونوں میں بے انتہا محبت تھی۔ پیار تھا۔

میں اکثر دیکھا کرتا تھا۔ راجیشی جہاز کے عرشے پر ایک مخصوص جگہ کچھ گوشت رکھ دیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ گوشت رکھتے ہی سمندری پرندہ کہیں سے اڑتا ہوا آتا اور جھپٹ کر گوشت لے جاتا اور کبھی راجیشی کو پرندے کا انتظار کرنا

پڑتا۔ اور جب تک پرندہ گوشت لے نہیں جاتا وہ اسی جگہ کھڑی رہتی۔

میں سوچتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے۔ میں نے ایک دوبار معلوم بھی کرنا چاہا لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش ہو رہا کہ ممکن ہے یہ اس کا شوق ہو۔

راجیشی اور رمنا اکثر میرے کیبن میں بھی آجایا کرتے تھے اور ہم تینوں گھنٹوں باتیں کرتے رہتے تھے۔ ایک دن موقع پا کر جب کہ ہم دونوں ہی تنہا تھے میں نے رمنا سے کہا۔ یار تمہاری بیوی ہرروز پابندی سے سمندری پرندہ کو چارہ کھلاتی ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

''اس کا خیال ہے کہ یہ سمندری پرندہ روح ہے۔'' رمنا نے جواب دیا اور زور سے ہنسنے لگا۔

''روح ہے، کیا مطلب؟ میں نے چونک کر پوچھا۔

وہ اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولا۔'' دوست میں نے اس بے وقوف عورت کو بہت سمجھایا کہ توہمات کرنا چھوڑ دے لیکن وہ مانتی ہی نہیں۔''

''تم مجھے ٹھیک سے بتاؤ۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ میں ابھی تک کچھ سمجھ نہیں پایا ہوں۔''

''سنو! وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولا۔ سمندر میں سفر کرنے والوں کا یہ عقیدہ ہے کہ قادوس وہ روحیں ہیں جو سفر کے دوران مرجاتی ہیں۔''

''یہ قادوس کیا ہے؟ میں نے پوچھا۔

''یہ وہی سفید پرندہ ہے جسے راجیشی چارہ کھلاتی ہے۔'' رمنا نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ پھر سمندر کے پانی پر نظر جماتے ہوئے بولا'' ہزاروں سال سے

لوگوں کا عقیدہ ہے کہ جو لوگ بحری سفر کے دوران مرجاتے ہیں ان کی روحیں اس پرندے میں حلول کر جاتی ہیں۔۔۔۔اور۔۔۔یہ پرندے یا روحیں اسی طرح سمندر کی فضاؤں میں محوِ پرواز رہتی ہیں۔اور اگر کوئی جہاز منزل سے بھٹک جائے تو ان کی رہنمائی کرتی ہیں۔''

''یہ سب فضول باتیں ہیں۔ میں نے جھنجلا کر کہا کیا تم بھی ان باتوں پر یقین رکھتے ہو؟''

''نہیں ۔ میں ایسی باتوں کی طرف دھیان نہیں دیتا۔ وہ لاپروائی سے بولا۔لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ میرے دوسرے ساتھیوں میں سے ایک ساتھی جو کافی بوڑھا ہے ان باتوں پر اعتبار کرتا ہے اور وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ قادوس جہاز کو پیش آنے والے حادثے کی خبر دیتا ہے۔''

''ناممکن، قطعی ناممکن!''میں نے اس ہی طرح جواب دیا۔موجودہ علمی دور میں یہ سب باتیں بکواس ہیں۔ ہمارے پاس ایسے آلات موجود ہیں جو گھنٹوں پہلے آنے والے طوفان کی خبر دے سکتے ہیں۔''

''تم سچ کہہ رہے ہو۔''رمنا نے جواب دیا۔''لیکن جو لوگ سمندری زندگی کو اپنا لیتے ہیں،ان کی نظروں میں اس پرندے کی بڑی وقعت ہے۔ وہ اس کی بہت زیادہ قدر کرتے ہیں۔''

''بڑے ہی احمق ہیں وہ لوگ!''میں نے تمسخر سے کہا۔

''تم انہیں احمق کہتے ہو''اچانک راجیشی نے سامنے آ کر کہا۔شاید وہ دیر سے چھپ کر ہماری باتیں سن رہی تھی۔

اس کے اس طرح سامنے آجانے سے میں کچھ گھبرا سا گیا لیکن پھر فوراً ہی سنبھل کر بولا۔''تم خود سوچو۔ آج جب کہ مشکلات پر قابو پانے کی خاطر نئی نئی ایجادات سامنے موجود ہیں ، ایک پرندے کو نجات دہندہ سمجھ لینا کون سی عقلمندی ہے!''

''تمہیں یقین کر لینا چاہیئے کہ یہ سفید پرندے جو کہ مہیب سمندر پر سایہ کئے رہتے ہیں، درحقیقت ان کے جسموں میں ان بحری مسافروں کی روحیں ہیں جو دوران سفر مرجاتے ہیں۔''راجیشی نے جواب دیا۔

''تم یہ کس طرح کہہ سکتی ہو؟''میں نے پوچھا۔

''میں نے بارہا اس بات کا مشاہدہ کیا ہے۔''راجیشی نے بتایا''جب کہ میں اپنی ماں کے ساتھ سمندر میں مچھلیاں پکڑا کرتی تھی۔کئی بار ان پرندوں نے ہمیں سمندری طوفانوں سے بچایا ہے۔''

''یہ صرف تمہارا خیال ہے ورنہ طوفانوں سے ان پرندوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔''میں نے جواب دیا۔

''تعلق ہے۔''راجیشی اپنے الفاظ پر زور دے کر بولی۔''میری ماں کہتی تھی کہ میرا باپ سمندر میں ڈوب کر ہلاک ہوا تھا۔۔۔اور۔۔۔۔اور۔۔۔۔اس کی روح ایک قادوس کے جسم میں موجود تھی۔وہی قادوس میری ماں کو حادثات سے آگاہ کرتا تھا۔''

''کیسی بے وقوفی کی بات کر رہی ہو!''میں نے جھنجلا کر کہا۔''تمہارا باپ سمندر میں ڈوب کر مرا تھا،اس لئے اس کی روح ایک پرندے کے جسم میں داخل

ہوگئی اور وہ تمہیں حادثات سے آگاہ کرتا تھا! کیسا مذاق ہے یہ۔ بھلا ایک پرندہ کس طرح حادثہ سے آگاہ کرسکتا ہے؟''

''تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔'' وہ اسی طرح سنجیدگی سے بولی۔ ''لیکن تم حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتے۔ یہ پرندہ خطرہ کے وقت نہایت ہی دل خراش آواز نکالتا ہے۔۔۔اور جس شخص سے اس کا لگاؤ ہوتا ہے اس کے چاروں طرف منڈلاتا رہتا ہے۔''

''اچھا، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم جس پرندے کو چارہ کھلاتی ہو اس سے تمہارا روحانی تعلق ہے۔''

''ہاں وہ میری ماں کی روح ہے۔'' راجیشی نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

''نہیں، یہ نہیں ہوسکتا۔'' میں نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''مرنے کے بعد کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تمہارا باپ مرگیا، بس۔ تمہاری ماں مرگئی، اس کی کوئی روح نہیں جو کسی قادوس کے جسم میں داخل ہوکر زندہ انسانوں کی رہنمائی کرے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم روحوں پر اعتبار نہیں کرتے؟'' راجیشی نے جیسے مجھ سے پوچھا۔

''بالکل، میں روحوں کو نہیں مانتا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''انسان مرگیا، بس۔ پھر کوئی زندگی نہیں''

''تم نہ جانے کس طرح کے انسان ہو!'' راجیشی نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''تم روحوں پر اعتبار نہیں کرتے ہو، موت کے بعد زندگی پر یقین نہیں کرتے

ہو''

پھر اس نے اپنے سر کو اس انداز میں جھٹکا دیا جیسے میری عقل پر اسے شک ہو یا میں اس کی سمجھ میں نہ آنے والی کوئی شے ہوں۔ اور پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا اس نے اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے ساتھ لے کر چلی گئی۔

مجھے راجیشی کی ان باتوں سے چڑ سی ہوگئی تھی۔ اسے ہر وقت قادوس کی تلاش رہتی تھی اور جیسے ہی کوئی پرندہ جہاز کے کسی نہ کسی حصے پر آکر بیٹھتا وہ مچھلی یا گوشت کا ٹکڑا لے کر وہاں دوڑتی۔

میں نے راجیشی کو کئی بار سمجھایا کہ وہ ان فضول باتوں کو چھوڑ دے۔ مرنے کے بعد کچھ بھی نہیں ہوتا۔ انسان تو صرف ایک مشین ہے، جب چلتے چلتے رک جاتی ہے تو بے مصرف ہوجاتی ہے۔ روح یا مرنے کے بعد کسی بھی قسم کی حرکت بعید از خیال ہے۔ یہ سب ناقص العقل لوگوں کی باتیں ہیں۔

میری باتوں پر وہ توجہ نہیں دیتی تھی لیکن میں اسے مادہ پرستی طرف رجوع کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ اس کا شوہر رمنا یوں تو میری ہاں میں ہاں ملاتا رہتا تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ بھی مذہب اور روحانیت کا زیادہ قائل تھا۔

بہرحال، میرا یہ سفر اسی طرح جاری تھا۔

ہم سمندر میں سفر کرتے رہے اور پھر ایک دوپہر سنیچر کے دن ہمارا جہاز کراچی کی بندرگاہ میں لنگرانداز ہوا۔

میں عرشہ پر ریلنگ سے ٹک کر کھڑا ہوگیا۔ میری نگاہیں اس شہر کے ساحل کا

نظارہ کر رہی تھیں جو کہ ابھی نوزائیدہ تھا، جس کے بارے میں سنا تھا کہ یہ ملک ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے جائے پناہ ہے۔ ہندوستان کے مسلمان جہاں اپنے مذہبی قوانین کے مطابق زندگی گزاریں گے اور یہ ایک فلاحی مملکت ہوگی۔ تاریخِ اسلام کا واقعۂ ہجرت میرے ذہن میں تازہ ہوگیا۔ جب آفتابِ رسالت مکہ میں طلوع ہوا اور کافروں کی نگاہیں اس سے چکاچوند ہونے لگیں تو ان لوگوں نے مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا اور پھر حکمِ خداوندی کے مطابق مسلمانوں نے مدینہ ہجرت کی تھی۔ مدینہ مکّہ کے مسلمانوں کیلئے جائے پناہ تھا، جائے امان تھا۔ مدینہ میں اسلام نے وسعت پائی، فروغ پایا، پھلا پھولا اور پروان چڑھا حتیٰ کہ ایک دنیا اس کے زیرِ نگیں آگئی۔

تو کیا___ یہ ملک بھی اسلام کا گہوارہ بن جائے گا، کیا تاریخ کا سنہری دور پھر پلٹ آئے گا۔۔۔۔۔! ایک بار تو دل میں آیا کہ یہیں اتر جاؤں لیکن پھر سوچا یہ سب فضول باتیں ہیں۔ مذہب کے نام پر عقلمند لوگوں نے کم عقل والوں کو ہمیشہ بے وقوف بنایا ہے۔ جانے یہ سب کیا گورکھ دھندا ہے۔

میں نے خیالات کو جھٹکا اور نیچے دیکھنے لگا۔ موٹر لانچوں کی آمدورفت زورو شور سے جاری تھی۔ نئے مسافر آرہے تھے اور پرانے مسافر جارہے تھے۔

میں نے ایک نظر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ جانے والے مسافروں کا کوڑا اکرکٹ عرشہ پر ادھر سے ادھر اڑتا پھر رہا تھا۔ میں دوبارہ سمندر میں دیکھنے لگا۔ جہاز میں سوار ہونے والے مسافروں میں چند سبک رفتار خواتین اور ایک چپٹے منہ والا چینی مسافر بھی تھا۔ اس چینی کے گلے میں موٹے دانوں کی ایک تسبیح تھی اور اس نے سر پر ایک بڑا

سا سفید رنگ کا رومال باندھ رکھا تھا۔

ان مسافروں کے اوپر آجانے کے بعد سیڑھی ہٹالی گئی۔ اور تقریباً ایک گھنٹہ بعد جہاز نے روانگی کا سائرن بجایا۔ یہ سورج غروب ہونے کا وقت تھا۔ دور مغرب میں سورج آہستہ آہستہ سمندر کی تہہ میں بیٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ اور تمام آسمان سرخ انگارہ بنا ہوا تھا۔

میں کافی دیر تک اس منظر کو دیکھتا رہا پھر ٹہلتا ہوا اپنے کیبن کی طرف چل دیا۔ جب میں کیبن میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر دروازے پر ہی رک گیا کہ میرے کیبن میں سامنے والی برتھ پر وہی چینی مسافر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی نہایت صاف اردو میں بولا۔ ''اس کیبن میں آپ ہی سفر کر رہے ہیں کیا۔؟''

اس چینی کو صاف اردو بولتے دیکھ کر مجھے تعجب ہوا میں نے اقرار کے انداز میں گردن ہلائی اور آگے بڑھ کر بڑی ہی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ چینی اردو کہاں سے سیکھ گیا۔

''میرا نام یوسف تشیک ہے۔'' اس نے اپنا تعارف کرایا۔

''مجھے مسٹر۔۔۔۔۔۔ کہتے ہیں۔'' میں نے اپنا نام بتایا۔

''میں عمرہ کے لئے سعودی عرب جارہا ہوں۔'' اس نے بتایا اور پھر معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اور شاید آپ بھی وہیں جارہے ہیں؟''

''جی ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن میں سکونت کی غرض سے جارہا ہوں۔''

''خوش قسمت ہیں آپ!'' اس نے نہایت ہی حسرت سے کہا۔ ''اس

مقدس زمین پر بہت کم لوگوں کو رہنے کی اجازت ملتی ہے۔"

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"بس، اللہ کی مرضی!" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"اوہو، تو آپ مسلمان ہیں!" میں نے اس طرح پوچھا جیسے اس کی بات سے حیران ہوا ہوں۔

"الحمد للہ! یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے مجھے سیدھا راستہ دکھایا۔" یوسف تشیک نے نہایت ہی خوش دلی سے جواب دیا۔

"بہت خوب! پھر تو سفر نہایت آرام سے کٹے گا۔" میں نے جواب دیا۔ اور اپنی برتھ پر بیٹھ گیا۔

بمبئی سے کراچی تک کا سفر میں نے وشگی، راجیشی اور اس کے شوہر رمنا وغیرہ کے ساتھ گزارا تھا۔ ایسے طویل سفر میں وقت گزارنے کے لئے دوستوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ میری ان لوگوں سے دوستی جہاز پر ہی ہوئی تھی۔ یہ لوگ اکثر رات میرے کیبن ہی میں تاش وغیرہ کھیل کر گزارتے تھے اور عموماً ایسا بھی ہوتا تھا کہ جس کو نیند آئی وہ وہیں پاؤں سکیڑ کر سو گیا۔ دن میں میرا کیبن خالی رہتا تھا۔ کیوں کہ وشگی اپنی بیوی اور بچوں کو لے کر عرشے پر چلا جاتا تھا۔ رمنا اپنے کام میں مصروف ہو جاتا اور اس کی بیوی قادوس کو چارہ کھلاتی رہتی۔ اور میں اکیلا اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا تھا۔ لیکن اب چینی مسافر یوسف تشیک کے آجانے سے تنہائی کا احساس ختم ہو گیا۔

چینی مسافر یوسف تشیک کا تعارف میں نے وشگی، اس کی بیوی، رمنا اور اس کی بیوی راجیشی چاروں سے کرا دیا وہ سب یوسف تشیک سے مل کر بہت خوش

ہوئے۔

اسی رات کھانے کے بعد چینی مسافر نے اپنے بارے میں مختصر طور سے بتایا کہ وہ بودھ مذہب کا پیدائشی پیروکار تھا لیکن شعور کی منزل میں داخل ہونے کے بعد زندگی اور حاصلِ زندگی کا مقصد سمجھنے کی خاطر اس نے دنیا کے مختلف مذاہب کا گہرا مطالعہ اور مشاہدہ کیا۔ اور بالآخر اسلام کو سچا جان کر مسلمان ہو گیا۔ اب اس کا نام یوسف تشیک تھا۔

یوسف تشیک کا کہنا تھا کہ اس نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے، کسی حد تک تصوّف کی منزلیں بھی طے کر چکا ہے اور اب مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لئے سعودی عرب جا رہا ہے اسے اللہ، رسول ﷺ اور اسلام سے والہانہ عشق تھا۔

یہ عجیب اتفاق تھا کہ میں جس کا اسلام موروثی مذہب تھا، اس سے دل برداشتہ تھا۔ اور نہ صرف اسلام بلکہ کسی بھی مذہب سے کوئی لگاؤ نہ تھا اور میرا ہم سفر ایک ایسا شخص تھا جس نے نجات کی راہ اسلام میں تلاش کر لی تھی، جس نے عیسائیت، یہودیت اور دیگر مذاہب کا نہ صرف گہرا مطالعہ کیا تھا بلکہ گہرا مشاہدہ بھی کیا تھا۔ اور آخر میں اسلام ہی کو جائے پناہ سمجھا، اور اب وہ نہایت پرسکون زندگی بسر کر رہا تھا۔

میں نے اپنا اور اس کا موازنہ کیا۔۔۔۔

آخر اسلام میں اس شخص کو ایسی کون سی خوبی نظر آئی؟ اور۔۔۔ اور پھر میرا مادہ پرست ذہن پوری طرح بیدار ہو گیا۔ یوسف تشیک مذہبی شخص تھا اور میری یہ کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح اسے قائل کر دوں کہ مذہب محض زندگی سے فرار کا ایک راستہ ہے۔

راجبشی سے مرنے کے بعد کے موضوع ''روح'' پر میں بے دھڑک بات کر چکا تھا اور جب بھی مجھے موقع ملتا، میں اسے ٹوکتا رہتا تھا۔ اس کے باوجود میں یوسف تشیک سے بات کرتے ہوئے جھجکتا تھا۔ حالانکہ وہ جوانی کی حدود کو پار کر چکا تھا اور اب وہ عمر کے اس حصے میں تھا جہاں جذبات کی یلغار نہیں ہوتی۔ بلکہ ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ مذہبی ذہن کے لوگ نہایت ہی نازک مزاج ہوتے ہیں۔ اور مخالف بات برداشت نہیں کر سکتے پھر بھی میں موقع کی تلاش میں رہتا تھا۔

ایک ایسی ہی رات کا واقعہ ہے جب کہ میں اور چینی مسافر یوسف تشیک کھانے سے فارغ ہوئے تھے کہ راجبشی ہمارے کیبن میں داخل ہوئی اور نہایت ہی خوش دلی سے بولی۔ ''ابھی ابھی میں نے قادوس کو مچھلی کا گوشت کھلایا ہے۔۔۔۔ اگر تم۔۔۔۔''

''آج خلاف توقع رات کو تم نے قادوس کو کیسے کھانا کھلا دیا؟'' میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔ ''جب کہ ابھی تک تم ہی بتاتی آئی ہو کہ وہ دن کو آتا ہے۔ اور میں نے بھی اسے دن ہی کو آتے دیکھا ہے۔''

میری اس بات کا جواب دینے کی بجائے وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ ''ہاں، یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ وہ رات کو کیوں آیا؟'' راجبشی بڑبڑائی۔ ''رات کو قادوس کا آنا اچھا نہیں۔۔۔ اچھا نہیں۔۔۔'' پھر وہ گھبراہٹ کے عالم میں واپس چلی گئی۔

''کیا بات ہے، یہ قادوس کا کیا چکر ہے؟'' مجھ سے یوسف تشیک نے

پوچھا۔

میں نے اسے ساری بات بتا دی جو راجبشی نے مجھے بتائی تھی۔ پھر میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا تم موت کے بعد کی زندگی پر یقین رکھتے ہو؟''

یوسف تشیک میری بات سن کر مسکراتے ہوئے بولا ''کسی بھی مذہب کی بنیاد ہی دراصل ابدی زندگی ہوتی ہے، اگر کوئی موت کے بعد زندگی پر اعتبار نہیں کرتا تو وہ کسی بھی مذہب کا پیرو نہیں ہو سکتا۔''

''اور اگر کوئی مذہب کو تسلیم ہی نہ کرے تو۔۔۔۔'' میں نے پوچھا۔

''ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔'' یوسف تشیک بولا۔ ''ان کو زندگی گزارنے کی خاطر کسی نہ کسی مذہب کو، کسی نہ کسی تعلق کو اپنانا ہی پڑتا ہے۔ جس طرح انسان لباس کے بغیر نہیں رہ سکتا اسی طرح وہ کسی نظریہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔''

''لیکن ___ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ہونا ضروری نہیں ہے۔ میں نے مادہ پرستی کی جانب رجوع کرتے ہوئے جواب دیا۔ انسان مادے کے سہارے زندگی بسر کرتا ہے اور جس کے سہارے وہ زندگی بسر کرتا ہے اسی پر اسے قناعت کرنا چاہیئے۔''

''مجھے تمہاری اس بات سے اتفاق ہے کہ انسان مادے کے سہارے زندگی بسر کرتا ہے۔'' وہ پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن مجھے اس سے قطعی اتفاق نہیں کہ مذہب انسان کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔''

''لیکن میرا کوئی مذہب نہیں، کوئی نظریہ نہیں۔ اس کے باوجود میں زندگی بسر کر رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہ غلط ہے۔'' وہ نہایت ہی دلفریب مسکراہٹ سے بولا۔ ''تمہارا یہ نظریہ

ہی کافی ہے کہ انسان کے لئے مذہب کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور تم اس نظریہ کے تحت مادہ پرست کی زندگی بسر کر رہے ہو۔"

اس کے اس جواب نے مجھے کسی حد تک لاجواب کر دیا لیکن پھر میں سنبھل کر بولا۔ "انسان آج سے لاکھوں برس قبل بھی اس کرۂ ارض پر موجود تھا اور اس عرصہ میں اس نے جس اطمینان، قناعت اور سکون کے ساتھ زندگی بسر کی ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے حالانکہ اس زمین پر زلزلے بھی آتے تھے، طوفان بھی برپا ہوتے تھے، آتش فشاں بھی آگ اگلتے تھے، قیامت خیز بارشیں بھی ہوتی تھیں لیکن ان کے سکون میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔"

"شاید تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ مادہ پرستی کا دور تھا۔ اس لیے وہ پرسکون زمانہ تھا؟" یوسف تشیک نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "ہاں، بات یہی ہے۔"

"نہیں، بات یہ نہیں ہے۔" یوسف تشیک نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "بلکہ اس وقت کرۂ ارض پر سناٹا تھا۔ انسان ایک دوسرے سے بہت دور اور الگ تھلگ بستا تھا۔ تہذیبیں جدا جدا نشوونما پاتی تھیں، قوم کا کوئی تصور نہیں تھا، کسی کو برتری کا احساس نہیں تھا، کوئی خود کو افضل نہیں سمجھتا تھا۔ گو کہ وہ نہایت پسماندگی کا دور تھا لیکن اس پسماندگی میں سکون تھا، حسن تھا، وقار تھا کیونکہ حیات اور کائنات کے بارے میں انسان کے نظریات واضح اور مقاصد متعین تھے۔"

"پرانی سائنس، پرانا علم، پرانی تہذیبیں سب قصۂ پارینہ بن چکی ہیں۔" میں نے اپنی بات کی خود تردید کرتے ہوئے کہا۔ "اس وقت انسان شعور کی

منزلیں طے کر رہا تھا۔ اس کی سوچ محدود تھی۔"

"بہت خوب!" یوسف تشیک نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "تم اپنی بات کی خود ہی نفی بھی کرتے ہو۔ تم اس بات کو تسلیم کرتے ہو کہ انسان لاکھوں سال قبل شعور کی منزلیں طے کر رہا تھا۔"

میں نے اقرار کے انداز میں گردن ہلائی۔

"تو پھر، تم اس بات کو بھی سمجھ لو۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "کہ انسان آج بھی شعور کی منزلیں طے کر رہا ہے۔" اور جب تک وہ اس کرۂ ارض پر موجود رہے گا، اس کا شعور اس کی سوچ محدود رہے گی۔ اور یہ فطرت کا اٹل قانون ہے کہ زمانہ اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک انسانی ذہن میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس وقت کے انسان میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیلی بھی ہوتی چلی گئی۔ اور وہی انسان شعور کی منزلیں طے کرتا ہوا آج کے دور میں داخل ہو چکا ہے۔"

"لیکن یہ اس کے شعور کی ترقی نہیں ہے کیوں کہ اب وہ مذہب، قوم اور دوسرے مختلف نظریوں میں بٹ چکا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"ہاں، اس دور کا انسان دونوں طریقوں سے زندہ ہے۔" یوسف تشیک نے جواب دیا۔ "درحقیقت انسان شروع ہی سے اس کائنات اور اس کے خالق کی جستجو میں مصروف رہا ہے۔ اور اسی کوشش کا نتیجہ ہے کہ وہ کبھی خالق کائنات کے وجود کو تسلیم کر لیتا ہے اور کبھی منکر ہو کر صرف اس کائنات ہی کو سب کچھ سمجھنے لگتا ہے۔ اور اس طرح وہ مادہ پرست بھی بن جاتا ہے۔"

یوسف تشیک کو میں نے یوں ہی ایک معمولی انسان سمجھ رکھا تھا ____ لیکن

اس مختصر سی گفتگو سے مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ نہایت قابل شخص ہے۔ مجھے اپنے اس ہم سفر سے مل کر خوشی بھی ہوئی تھی کہ میرا سفر ایک اعلیٰ ذہن کے شخص کی معیت میں طے ہو رہا تھا۔

وہ مذہبی آدمی تھا اور میں لادین۔ یقینی بات ہے کہ ہم دونوں کے نظریات دریا کے دو کناروں کی مانند تھے جو کبھی اپنی اپنی سیدھ میں ایک دوسرے سے نہیں ملتے لیکن اس کے باوجود ہماری بحث کا آغاز جس طرح خوش گوار ماحول میں شروع ہوتا تھا اسی طرح خوش دلی کے ساتھ ختم بھی ہو جاتا تھا۔

ایک دن میں وشگی کے ساتھ عرشے پر کھڑا سمندر کا نظارہ کر رہا تھا، یوسف تشیک بھی ساتھ تھا۔ سمندر کی سطح پر چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ وشگی بڑی ہی گہری سوچ سے بولا۔ ''بھگوان کی بھی کیا شان ہے۔ جس طرح پانی کی سطح پر مچھلیاں تیر رہی ہیں اسی طرح یہ جہاز بھی ہم سب کو لئے تیر رہا ہے۔''

''اس میں بھگوان کی تعریف کرنے کی کیا بات ہے!'' میں نے چڑ کر کہا۔ ''یہ تو انسان کی اپنے شعور کی بات ہے کہ اس نے سطح آب پر بھی چلنا سیکھ لیا۔''

میری بات سن کر وشگی خاموشی سے میرا چہرہ تکنے لگا۔ لیکن یوسف تشیک جو تسبیح کے دانوں پر کچھ پڑھ رہا تھا فوراً بول اٹھا۔ ''اگر کوئی غلام اپنی دماغی اور جسمانی صلاحیتوں سے ایسا کام کرتا ہے جس سے بھلائی مقصود ہو تو اسے یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس نے جو کام بھی انجام دیا ہے اس میں اس کے آقا کی مرضی شامل تھی اور اس طرح اسے اپنی صلاحیتوں سے زیادہ اپنے آقا کی پشت پناہی کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ سب سے بڑی طاقت ''اللہ'' ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجہ میں بولا۔ ''اور جب وہ سب سے بڑی طاقت ہے تو یقیناً وہ ان تمام صفات کا مجموعہ ہے جو انسان شعوری طور پر جانتا ہے۔'' پھر وہ ایک لمبی سانس لے کر بولا۔ ''اللہ کے بارے میں ہمیں یقین کر لینا چاہیئے کہ اس کی ایک صفت سے دوسری صفت کو تقدم نہیں کہ وہ اول ہونے سے پہلے آخر تھا، اور ظاہر ہونے سے پہلے باطن رہا ہے۔ اللہ کے علاوہ جس کی بھی صفات بیان کی جائیں گی وہ قلت اور کمی میں ہوں گی۔

اللہ کے سوا، ہر باعزت ذلیل
اللہ کے سوا، ہر قوی کمزور
اللہ کے سوا، ہر جابر عاجز
اللہ کے سوا، ہر مالک مملوک اور ہر جاننے والا سیکھنے کی منزل میں ہے۔''

''یہ تم نے ایک ان دیکھی ہستی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''دنیا کے جتنے بھی مذاہب ہیں وہ سب ایک لامحدود طاقت 'اللہ' کا تصور پیش کرتے ہیں، اسی کو خالق کائنات اور حیات و موت کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے اور پوری کائنات کو اسی کا مطیع اور فرمانبردار بتاتے ہیں حالانکہ اس تصور سے انسانی ترقی کا کوئی واسطہ نہیں۔''

''یہ تصور ہی تو انسان کو ترقی کی منزل تک لے جاتا ہے۔'' یوسف تشیک نے جواب دیا۔ ''اگر انسان صرف اس کائنات کے خالق کی جسے اللہ کہا جاتا ہے

بندگی اور اطاعت کرنے پر مامور ہے تو اس کی بندگی کی یہ تعریف ہے کہ پورا نظامِ زندگی اپنے تمام شعبوں اور پہلوؤں کے ساتھ اطاعتِ الٰہی کے تحت آجاتا ہے اور اس کے تحت انسان خواہ باپ ہو، بیٹا ہو، بھائی ہو، بیوی ہو، خاندان ہو، قوم ہو یا حکومت اسے اللہ کی اطاعت کرنا ہے اور جب ایسا ہے تو انسان ترقی کی انتہائی منزلیں طے کرلیتا ہے۔"

"وہ کیسے، جب کہ اطاعت و بندگی کا قانون مادی ترقی سے جُدا ہے۔؟" میں نے پوچھا۔

☆☆☆

دینِ فطرت

"ہمیں یہ بھی مان لینا چاہیئے کہ اللہ کے فیصلے اٹل اور اس کے احکام قطعی ہیں۔" یوسف تشیک نے مسکرا کر کہا۔ "اطاعتِ الٰہی اور مادی ترقی ایک دوسرے سے قطعی جدا نہیں ہیں۔ انسانی ترقی ہی درحقیقت "احکامِ الٰہی" ہے" پھر وہ خلا میں گھورتے ہوئے بولا۔ "نظامِ قدرت کچھ اس طرح سے ہے کہ جو زمانہ انسان کو گردش میں لا رہا ہے وہ احکامِ الٰہی سے لبریز ہے ماضی، حال اور مستقبل جو کچھ بھی ہے سب اللہ کے تابع ہے۔

ماضی وہ ہے، جس میں احکامِ الٰہی پر عمل ہو چکا ہے۔

حال وہ ہے، جس میں احکامِ الٰہی کا ظہور ہو رہا ہے۔

مستقبل وہ ہے، جس میں احکامِ الٰہی پوشیدہ ہیں۔

اب اللہ اپنے فیصلوں اور احکامات پر عمل کرنے کے اسباب بناتا ہے جسے انسان اپنی کوشش قرار دیتا ہے حالانکہ جس دن جو وقت، جو لمحہ مقرر ہے اسی لمحہ فیصلہ پر عمل ہوتا ہے۔ اور مستقبل کا لمحہ حال بنکر ماضی میں چلا جاتا ہے۔ ماضی وہ زمانہ ہے، جس میں احکامِ الٰہی پر پورا پورا عمل درآمد ہو چکا ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ بھی ہوا ہے وہ اس کی اپنی جسمانی و دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہے تو یہ اس کی بھول ہے۔ یہ پوری کائنات احکاماتِ الٰہی اور اس کے فیصلوں سے کمپیوٹرائزڈ (computerised) ہے۔ ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے جنبش نہیں کرسکتا۔"

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ انسان وقت کا پابند ہے اور یہاں کا ذرہ بھی اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر سکتا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور انسان جسے اپنی ترقی کہتا ہے وہ سب صلاحیتیں اللہ کی طرف سے ہیں۔''

''ہاں، اب تم کسی حد تک بات سمجھ رہے ہو۔ یوسف تشیک نے مسکرا کر کہا۔'' اللہ نے جو فیصلہ، جو حکم جس وسیلے سے، جس سبب سے مقرر کر دیا ہے اسے عمل میں آنے کے لئے ایک لمحہ کی تاخیر بھی ممکن نہیں اور وقت احکامِ الٰہی کا مطیع ہے۔ اللہ نے انسان کو وقت کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔''

''لیکن، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے وجود کو کس طرح تسلیم کیا جائے؟ ''میں نے سوچ کر پوچھا۔'' انسانی شعور ایک ان دیکھی ذات کو کیوں کر تسلیم کر لے اور.... اور پھر.... یہ نام وجود میں کس طرح آیا؟''

''تم نے ایک سوال میں کئی سوالات کر ڈالے۔ یوسف تشیک اسی طرح خوش مزاجی کے انداز میں بولا۔'' اللہ کے نام سے یہ دنیا کیوں کر روشناس ہوئی....

دراصل انسان جبلی طور سے کمزور واقع ہوا ہے۔ وہ ناگہانی آفتوں سے گھبرا جاتا ہے۔ اپنی اس فطری کمزوری کی وجہ سے وہ چاند، سورج اور ستاروں کے سامنے سر جھکانے لگا بلکہ کبھی کبھی تو وقت پڑنے پر وہ اپنے اپنے مصرف کی چیزوں حتیٰ کے پتھر تک کو خود سے زیادہ طاقت ور سمجھ کر اس کے سامنے عاجزی کرنے لگا۔ انسان کی اس بدحواسی کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو دنیا میں بھیجتا رہا جو انسان کو سمجھاتے تھے کہ تم جن چیزوں کو طاقتور سمجھ کر ان کے سامنے سر جھکاتے ہو، ان سب سے زیادہ طاقتور تو ان سب کا پیدا کرنے والا ہے اور اس طرح لوگ اس کائنات کے خالق کے

نام 'اللہ' سے آشنا ہوئے۔''

''لیکن فرض کرو، اگر کوئی اس نام سے منسلک ذات کے وجود کو ماننے سے انکار کر دے تو؟'' وشگی نے، جو دیر سے ہماری گفتگو سن رہا تھا، بیچ میں بول کر میرے دل کی بات کہہ دی تھی۔

''ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔'' یوسف تشیک عرشہ کے کٹہرے سے ٹیک لگا کر بولا۔'' اس کائنات کی موجودگی اس کے خالق کا ثبوت ہے۔ جس طرح اس کائنات کی موجودگی سے انکار ممکن نہیں، اسی طرح اس کے خالق سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر کوئی ایسا سوچتا ہے تو اس کے اندر ایمان نہیں ہے۔''

''ایمان!۔۔۔۔ یہ ایمان کیا ہے؟'' وشگی نے پوچھا۔

''یقین و اعتماد کو ایمان کہتے ہیں۔'' چینی مسافر یوسف تشیک مسکرا کر بولا۔'' ایمان سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر اس قدر پختہ یقین ہو کہ اس کے بارے میں ادنیٰ سا شک وشبہ بھی انسان کے دل و دماغ میں پیدا نہ ہو۔ پھر ذاتِ الٰہی سے وابستہ وحی، فرشتے اور یوم قیامت پر بھی اس ہی طرح کا مکمل اعتماد ہونا ضروری ہے۔ جب تک کوئی انسان ان عناصر کی حقیقت کو تہہ دل سے قبول نہیں کرتا، اس کا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔''

''لیکن یہ وہ عناصر ہیں جن کے نام سے تو انسان آشنا ہے اور دیکھا کسی نے نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور انسان۔۔۔۔''

''ایمان اسی کو تو کہتے ہیں۔'' یوسف تشیک میری بات کاٹ کر بولا۔'' انسان سچے دل سے اس بات کو قبول کر لے اور اس حقیقت کو تسلیم کر لے جو

انبیاءعلیہم السلام نے فرمائی ہے۔"

"لیکن اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ ان نبیوں نے جو کچھ بتایا ہے وہ سب سچ ہے۔"میں نے ذرا جھجکتے ہوئے یہ سوال کیا۔

"تم نے بات پھر وہی شک وشبے والی کہی ہے۔"یوسف تشیک نے جواب دیا۔"انبیائے کرام کے سچ کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مادی وسیلہ بھی رکھا ہے۔"

"وہ کیا ہے؟"میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"وہ تاریخ ہے۔"یوسف تشیک نے کہا۔ پھر میری جانب انگلی اٹھا کر بولا۔"تم نے تاریخ کا مطالعہ تو کیا ہوگا۔ پچھلی تہذیبوں کے نشانات آج بھی کرۂ ارض پر عبرت کے نمونوں کی صورت میں موجود ہیں۔ خود کو سب سے زیادہ طاقت ور سمجھنے والی قومیں جنھوں نے اپنے نبیوں کے پیغام کو ماننے کی بجائے انہیں رد کر دیا اور مادہ ہی کو اپنا سب کچھ سمجھ لیا، نقش پا کی طرح مٹ چکی ہیں۔ اور قدرت نے ان کے کھنڈرات کو نمونۂ عبرت بنا رکھا ہے۔ زندگی کی مادی حقیقت کا اقرار اور روحانی حقیقت سے انکار ان کو لے ڈوبا۔"

یوسف تشیک کا جواب سننے کے ساتھ ہی میری نگاہیں غیر دانستہ طور پر جہاز کے مستولوں کی جانب اٹھ گئیں میں نے دیکھا تین سمندری پرندے افق سے نمودار ہوئے اور بھیانک آواز میں چیختے ہوئے ہمارے سروں پر سے گزر گئے۔ ان کی آوازیں سنتے ہی وشگی اور یوسف تشیک بھی آسمان کی جانب تکنے لگے۔ نجانے کیوں ہم تینوں کی نگاہیں ان تینوں پرندوں کا تعاقب کر رہی تھیں جو لمحہ بہ لمحہ ہماری نظروں

سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ پھر وہ سمندر کی اونچی اونچی لہروں کے پیچھے چھپ گئے۔

"تم نے دیکھا؟"یوسف تشیک نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔"اس کائنات کے خالق نے کیسی کیسی چیزیں پیدا کی ہیں!"

ابھی میں یوسف تشیک کی بات کا جواب دے بھی نہ سکا تھا کہ راجبشی نہایت تیز رفتاری سے ہمارے پاس آ کر بولی۔"تم لوگ فوراً اپنے اپنے کیبن میں چلے جاؤ۔"

"کیوں، خیر تو ہے؟"وشگی نے اس سے پوچھا۔

"ہم کسی آفت میں مبتلا ہونے والے ہیں۔"راجبشی نے پھولی ہوئی سانس سے جواب دیا۔"تم نے ان تین قادوسوں کو دیکھا جو ابھی جہاز پر سے گزرے ہیں؟"

اس کی یہ بات سن کر میں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اور پوچھا۔"کیا وہ تمہیں کچھ بتا گئے ہیں؟"

"ہاں!"راجبشی کسی قدر خوف زدہ لہجہ میں بولی۔"جب یہ پرندے کسی جہاز پر سے گزرتے ہوئے خوفناک قسم کی آوازیں نکالتے ہیں تو وہ جہاز کسی خطرے سے دوچار ہو جاتا ہے۔"

"گویا یہ پرندے خطرے کی گھنٹیاں ہیں۔"میں نے اس کا مذاق اڑایا۔

"بالکل، بالکل۔"اس نے جیسے میری بات کی تائید کی اور پھر اسی خوف زدہ لہجہ میں بولی۔"تم نے ان کی آواز نہیں سنی؟ کتنی خوفناک تھی! یہ پرندے ہمیشہ اس جہاز سے گزرتے ہیں جسے کوئی حادثہ پیش آنے والا ہوتا ہے۔"

"ہمارا یہ سفر نہایت پرسکون طور سے جاری ہے۔" میں نے طنزیہ لہجہ میں اس سے کہا۔ "اور ہم اسی طرح خوش گوار طور سے سفر کرتے رہیں گے۔"

"ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔" اس نے نہایت ہی پراعتماد انداز سے کہا۔ "میرا تجربہ غلط نہیں ہوسکتا۔ یہ پرندے جب بھی اس طرح سے گزرے ہیں، کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی دوسرے درجے کے عرشے کی جانب چلی گئی۔

میں نے یوسف تشیک سے مذاق اڑانے والے انداز میں پوچھا۔ "اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

یوسف تشیک نے اس جانب جدھر پرندے گئے تھے، دیکھتے ہوئے کہا۔ "اللہ تعالیٰ نے جانوروں میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ آنے والے خطرے سے پہلے آگاہ ہوجاتے ہیں اور وہ اپنی اس پیش بینی کا اظہار کسی مخصوص انداز میں کر دیتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے اور وشگی نے ایک ساتھ پوچھا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یہ کائنات احکامِ الٰہی سے کمپیوٹرائزڈ ہے۔" یوسف تشیک نے جواب دیا۔ "یہاں جو ظاہر ہونے والا ہے وہ مستقبل میں محفوظ کر دیا گیا ہے اور بعض حیوانات جن میں انسان بھی شامل ہے اکثر اپنی کسی صلاحیت کی بناپر ان احکاماتِ الٰہی سے قبل از وقت آگاہ ہوجاتے ہیں۔"

"اور ایسے ہی لوگوں کو اولیاء، اللہ سمجھا جاتا ہے۔" میں نے طنز کا تیر چلایا۔

یوسف تشیک نے اقرار کے طور پر سر ہلایا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "ممکن ہے ان پرندوں میں بھی یہ خوبی موجود ہو جس کا اظہار وہ اپنی مخصوص آواز سے کرتے ہوں اور ان کی یہ آواز صرف راجشیی پہچانتی ہو۔"

میں یوسف تشیک کی بات کا کوئی معقول جواب تلاش ہی کر رہا تھا کہ وشگی کو اس کی بیوی نے آواز دے لی۔ اور وشگی کے جاتے ہی یوسف تشیک بھی تسبیح کے دانوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

شام کی چائے میں نے اور یوسف تشیک نے بھی کیبن ہی میں منگوالی تھی۔

ابھی میں اور وہ چائے کا لطف لے رہے تھے کہ ہوا نے زور باندھا اور ساتھ ہی آسمان پر سیاہ بادل چھانے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان سیاہ ہوگیا اور کچھ دیر بعد ہی موسلا دھار بارش ہونے لگی۔

میں نے اپنے کیبن کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ اس وقت تیسرے درجے کے عرشے پر موجود مسافروں میں ہل چل سی برپا تھی۔ ہر شخص بارش سے بچنے کے لیے پناہ کی تلاش میں تھا۔ لوگوں نے سامان وہیں کھلی جگہ پر چھوڑ دیا اور خلاصیوں کی ہدایت پر خود عرشے کے نیچے چلے گئے۔

بارش اور ہوا کے ساتھ ہی سمندر میں اونچی اونچی لہریں اٹھنے لگیں اور جہاز ان کے نرغے میں آکر ہچکولے کھانے لگا جس کی وجہ سے جہاز میں زلزلے کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ میں نے اور چینی مسافر یوسف تشیک نے جلدی جلدی چائے ختم کی اور کیبن کی دیواروں سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئے۔

بارش کے تھپیڑے پوری قوت سے بند کھڑکیوں اور دروازوں سے ٹکرا

رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بندوق سے گولیاں چلائی جا رہی ہوں۔ بند کیبن کے اندر بھی طوفان کا مہیب شور اور بادلوں کی گرج صاف سنائی دے رہی تھی کھڑکی کے موٹے شیشوں کے باہر جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی، گھپ اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ کبھی کبھی بجلی چمکتی تو سمندر کی دیو پیکر لہریں جہاز سے ٹکراتی ہوئی دکھائی دیتیں۔

اس طوفان سے میں کچھ پریشان سا ہونے لگا لیکن چینی مسافر یوسف تشیک نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”بحری سفر میں اکثر و بیشتر اس قسم کے طوفان آتے رہتے ہیں۔ ان سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“ پھر اس نے گلے میں پڑی ہوئی چھوٹی سی تسبیح ہاتھ میں لی اور کچھ پڑھنے لگا۔

وہ بالکل ہی پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی بار بحری سفر کر چکا تھا۔

دفعتاً جہاز کو ایک زبردست جھٹکا لگا جیسے سڑک پر چلنے والی گاڑی کو اچانک بریک لگا دیا گیا ہو۔ پھر وہ ایک جانب کو تھوڑا سا جھکا اور اس کے ساتھ ہی سامان لڑھکتا ہوا نیچے آ رہا۔ چینی مسافر یوسف تشیک نے برتھ کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اس نے مجھے بھی برتھ پکڑنے کو کہا۔ اس طرح ہم لڑھکنے سے بچ گئے۔ جہاز دوبارہ آہستہ آہستہ اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ لیکن اب بارش کے شور میں بے شمار آدمیوں کی چیخنے چلانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ جہاز کے سیدھا ہوتے ہی وشگی اپنی بیوی کے ساتھ کیبن سے نکل آیا تھا اور پریشانی سے عرشے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے برتھ کو چھوڑا اور چینی مسفر سے ”ابھی آیا“ کہہ کر باہر کی طرف دوڑا۔

جب میں عرشہ پر پہنچا تو بہت سے لوگ کٹہرے کے ساتھ کھڑے سمندر کی

طرف دیکھ دیکھ کر چلا رہے تھے۔ اس مجمع میں جہاز کے عملے کے لوگ نہایت ہی تیزی سے ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ دو افسر جھکے ہوئے ہاتھوں کے اشاروں سے ایک دوسرے کو سمندر کی طرف کوئی چیز دکھا رہے تھے۔

میں نے بھی اسی سمت جدھر وہ اشارہ کر رہے تھے دیکھا۔ ایک چھوٹی سی چٹان کی نوک پانی کی سطح سے ذرا اوپر کو نکلی ہوئی تھی۔ گویا جہاز سمندر میں پوشیدہ کسی چٹان سے ٹکرایا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ طوفان باد و باراں میں وہ کپتان کو دکھائی نہ دی۔

جلد ہی ایک چھوٹے سے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کیا گیا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ جہاز سمندر میں پوشیدہ ایک چٹان سے ٹکرا گیا تھا جس سے جہاز کے اگلے حصے کو معمولی سا نقصان پہنچا تھا جسے فوراً ہی درست کر لیا گیا ہے پھر تمام مسافروں سے کہا گیا کہ وہ اپنے اپنے کیبنوں میں چلے جائیں۔ اس اعلان کے ساتھ ہی مسافروں میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ اور تمام لوگ اپنی اپنی راہ ہو گئے اور میں بھی اپنے کیبن میں واپس آ گیا۔

بارش کے اس طوفان میں جہاز آہستہ آہستہ دوبارہ منزل کی طرف گامزن ہو گیا۔

جب میں کیبن میں داخل ہوا تو راجشی پہلے ہی سے موجود تھی۔ اسے دیکھتے ہی مجھے صبح والی بات یاد آ گئی۔ جس میں اس نے جہاز پر سے اڑ کر جانے والے قادوسوں کو دیکھ کر حادثہ کے بارے میں پیشین گوئی کی تھی۔ اسے دیکھ کر میں قدرے جھجکا کیوں کہ قادوسوں کے وسیلے سے اس نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ کسی حد تک

درست ثابت ہو چکی تھی۔

لیکن دوسرے ہی لمحہ میرے مادہ پرست ذہن نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور میں نہایت ہی طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''شاید تم اپنی پیشین گوئی کے بارے میں تصدیق کرانے آئی ہو۔''

''ہاں، کیوں، کیا اب بھی تمہیں قادوسوں کے بارے میں شک ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''شک ہی نہیں، بلکہ میں تو اس واہیات خیال کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔'' میں نے ہنس کر جواب دیا۔

''وہ کیوں؟'' اس نے حیرانگی سے پوچھا۔ اس لئے کہ تم نے جس حادثہ کی پیشین گوئی کی تھی۔ وہ یقیناً اس جہاز پر موجود سائنسی آلات نے پہلے ہی کر دی ہوگی۔''

''شاید۔۔۔تم موسمی حالات کے بارے میں کہہ رہے ہو۔'' راجشی نے مسکرا کر کہا۔ ''بحری سفر کے دوران تو ایسے موسم سے سابقہ پڑتا ہی رہتا ہے۔ لیکن اصل حادثہ تو وہ تھا جو سمندر میں پوشیدہ چٹان سے پیش آیا۔''

''ہاں، اسے حادثہ کہا جا سکتا ہے۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''تم یقین جانو'' وہ نہایت سنجیدگی سے بولی۔ ''سمندر کے اس راستے پر ہم برسوں سے سفر کر رہے ہیں اور اس سمندر کے سینے میں جو کچھ بھی پوشیدہ ہے ہمیں سب معلوم ہے لیکن اس کے باوجود جہاز چٹان سے ٹکرا گیا۔''

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ طوفان بادوباراں میں کپتان کو چٹان نظر نہیں آئی

اور بس۔'' میں نے برتھ پر بیٹھے ہوئے جواب دیا۔'' اگر وہ موسمی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ذرا فاصلہ سے جہاز کو نکال لے جاتا تو یہ حادثہ پیش نہ آتا۔

''وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔'' راجشی اعتماد سے بولی۔ ''قادوس جھوٹ نہیں بول سکتے۔ یہ حادثہ بہر صورت ہونا تھا۔''

''تم آج یہ بات کہہ سکتی ہو لیکن مستقبل میں انسان ایسے آلات بھی تیار کر لے گا جو ایسے غیر اتفاقی حادثات کی اطلاع پہلے دے دیا کریں گے۔''

راجشی میری بات سن کر خاموش ہو گئی جیسے اسے شکست ہو گئی ہو۔

''تمہاری یہ بات درست ہے۔'' یوسف تشیک نے کیبن کے دروازے میں داخل ہو کر کہا۔ وہ بھی باہر کے حالات معلوم کر کے آ رہا تھا۔ لیکن یہ سب روحانی ترقی کے بغیر ممکن نہیں۔

''زندگی کی اصل مادہ ہے۔ میں نے سوچ کر کہا اور روحانیت زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے فکر و عمل سے انسان کی بھلائی کے لئے کام کرے۔ زندگی کا مقصد دوسروں کے کام آنا ہے۔''

''بھلائی کا یہ تصور بھی تو روحانیت ہی سے حاصل ہوا ہے۔'' یوسف تشیک نے جواب دیا۔ اور پھر اپنی برتھ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''اور روحانیت مذہب کے بغیر ممکن نہیں۔''

''مذہب اور روحانیت کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل۔'' راجشی بولی۔

''چلو، اگر تمہاری اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر کوئی ایک مذہب ہونا

چاہئیے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کے برعکس، دنیا میں کئی مذاہب ہیں اور تم نے خود بتایا ہے کہ تم کئی مذاہب کا گہرا مطالعہ کر چکے ہو۔"

میری بات سن کر یوسف تشیک زور سے ہنسا، پھر قدرے سنجیدگی سے بولا۔ "میں نے تمہیں یہ بھی تو بتا دیا تھا نا کہ میں اسلام کی حقانیت پہچان کر مسلمان ہوا ہوں۔"

"ہاں تم نے بتایا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"تم نے اسلام کیوں قبول کیا؟" راجیشی نے اس سے پوچھا۔ "اسلام میں تمہیں کیا خوبی نظر آئی؟"

"اسلام ہی وہ سچا مذہب ہے جو مادّہ سے فیض یاب ہونے کا طریقہ بتا تا ہے۔" یوسف تشیک نے جواب دیا۔ "جہاں تک میرا اور اسلام کا تعلق ہے، تو یہ کچھ عجیب سی بات ہے۔" اتنا کہہ کر وہ لمحہ بھر کو چپ ہوا اور پھر میرے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے بولا۔ "دراصل میں بھی تمہاری طرح مادّہ پرست اور مذہب سے بیزار تھا۔"

"ایں۔۔۔!" اس انکشاف سے میں چونک اٹھا۔

"ہاں۔۔۔!" اس نے پاؤں پر پاؤں رکھ کر بڑے ہی اطمینان سے کہا۔ "یہ اس وقت کی بات ہے جب میرا ملک افیون کے نشے میں اونگھ رہا تھا۔ اور شہنشاہیت کے روپ میں آمریت مسلط تھی۔ دنیا کے چار بڑے ملک آپس میں دست و گریباں تھے، تو میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ میرا ملک جو آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے، اس قدر پس ماندہ کیوں ہے، میری قوم جو

نشے میں اونگھ رہی ہے کیا اسی طرح ہمیشہ اونگھتی رہے گی؟ میں نے اپنی قوم کے چند بیدار مغز آدمیوں کو دیکھا۔ انہوں نے چینی قوم کو بیدار کرنے کی خاطر اپنے نظریئے وضع کئے تھے لیکن وہ نظریئے فطرت سے ہم آہنگ نہیں تھے۔ پھر ان ہی دنوں جاپان پر ایٹم بم گرایا گیا جس سے لاکھوں انسان پلک جھپکتے موت کی آغوش میں جا سوئے۔

میں نے سوچا کہ آئن سٹائن، جس نے مادے کی قوت کا پتہ چلایا، کیا انسانوں کا دشمن ہے اور اگر مادہ انسان کا دشمن ہے، اگر مادہ پرست لوگ انسانوں کے بیری ہیں تو پھر انسان کو پناہ کہاں ملے گی، انسانیت کس طرح سرخرو ہو گی۔

اس سوچ نے مجھے تاریخ عالم کی طرف متوجہ کر دیا۔ اس وقت تک میں کئی الہامی مذاہب کا مطالعہ کر چکا تھا۔" اتنا کہہ کر یوسف تشیک نے ایک گہری سانس لی۔ اپنے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کر دوبارہ بولا۔ تاریخ عالم کے مطالعہ کے دوران ہی میری نظروں سے ایک کتاب "بونا پارٹ اور اسلام" گزری۔ اس کتاب میں ایک جگہ نپولین بونا پارٹ نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ایسا نظام رائج کیا جا سکتا ہے جو نہ صرف انسانوں کی بھلائی بلکہ ان کو مسرتوں سے بھی ہم کنار کر دے گا۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں" اتنا کہہ کر اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بتایا۔ "لیکن اس کا مفہوم کچھ یہی تھا۔"

"میں نے سوچا۔" وہ پہلے ہی کی طرح سلسلۂ کلام شروع کرتے ہوئے بولا۔ "اگر اسلام کے بارے میں ایک فاتح کے یہ خیالات ہیں تو کیوں نہ فکر و فہم کے ساتھ اس مذہب کا مطالعہ کیا جائے۔ بس میں نے اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اور مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ واقعی یہ واحد مذہب ہے جو روحانیت اور مادیت دونوں کو

ہم رشتہ رکھتا ہے۔''

''تم یہ بات کس طرح کہہ سکتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔ ''کوئی بھی مذہب مادیت کا ساتھ کس طرح دے سکتا ہے۔''

''اس مذہب میں ایسے اصول موجود ہیں جن کے تحت انسان مادی زندگی پرسکون گزارتا ہو۔'' یوسف تشیک نے جواب دیا۔ ''اور یہی وہ سچائی ہے جس نے مجھے اس دین کا گرویدہ بنادیا ہے۔ اس دین میں انسان کو اس کے تمام فطری اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کی ہدایات موجود ہیں۔''

پھر وہ ایک والہانہ جذبے سے بولا۔ ''اسی وجہ سے اسے دینِ فطرت بھی کہا جاتا ہے۔ اسلام دین حق ہے، اسلام دینِ فطرت ہے۔ خالق کائنات نے اس دین کے ذریعے تمام بنی نوع انسان کو بھلائی اور سچائی کا سبق دیا ہے یہی وہ ضابطۂ حیات ہے جو انسان کے تمام شعبہ ہائے زندگی میں جاری وساری ہے۔''

''لیکن مجھے تمہاری اس بات سے اتفاق نہیں ہے۔'' میں نے اپنے موقف کو دہرایا۔ دین اور دنیا دو الگ الگ عنوان ہیں۔''

''دین دنیا کا ساتھ نہیں دے سکتا۔'' اس نے میرے الفاظ کو دوہرایا۔ اور پھر اسی انداز سے بولا۔ ''یہی وہ جذبہ تھا جس نے مجھے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا۔ میں نے جتنے بھی مذاہب کو پرکھا ان میں یہی خامی تھی لیکن اسلام میں یہ خوبی ہے کہ وہ دنیا کا ساتھ بھی دیتا ہے اور حال ہو یا ماضی، پسماندہ دور ہو یا انتہائی ترقی یافتہ ہر جگہ، ہر زمانہ میں دنیا کے شانہ بشانہ چلتا ہوا بھی نظر آتا ہے مگر حزم واحتیاط کے چند اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔''

''تمہاری یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ممکن ہے تم یہ بات مذہبی جذبات کے تحت کہہ رہے ہو۔''

''نہیں، نہیں!'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے میرے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ ''میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اسلام سے اپنی وابستگی کی بنا پر نہیں بلکہ تمہیں اس دین کی حقیقت سے باخبر کررہا ہوں۔''

''اس ''حقیقت'' کا کوئی ثبوت بھی ہے تمہارے پاس؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نے قرآن پڑھا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں، ضرور پڑھا ہے۔'' میں نے نہایت فخر سے زرا اونچی آواز میں کہا۔ ''لیکن مجھے تو قرآن میں کہیں بھی۔۔۔۔''

''قرآن پڑھنے کا مقصد صرف ورق گردانی نہیں ہے۔'' اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ قرآن انسانیت کا امام ہے اور رہنمائے حیات ہے۔ ''قرآن پڑھتے وقت ہمیں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ ہم اس سے کس حد تک مستفید ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو رسول ﷺ پر محض برکت کے لئے نازل نہیں کیا بلکہ اس کی ہدایات پر عمل کرنے کو کہا گیا ہے۔''

''اگر ان ہدایات سے تمہارا مطلب، اخلاقیات ہے تو یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ ''جھوٹ برا ہے اور سچ اچھا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن جہاں تک مادہ کی ہیئت اور اس کو انسانی مصرف میں لانے کا تعلق ہے، قرآن اس بارے میں کیا کہتا ہے۔''

''قرآن اس بارے میں نہایت واضح الفاظ میں بتاتا ہے۔'' یہ کہہ کر

یوسف تشیک نے اپنے کوٹ کی جیب سے چھوٹا سا قرآن پاک نکالا اور سورۂ رحمٰن کی تلاوت کرنے لگا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رحمٰن نے، قرآن کی تعلیم دی۔ اس نے انسان کو پیدا کیا، اسی نے اس کو بولنا سکھایا، سورج اور چاند حساب سے چلتے ہیں اور بے تنے اور تنے دار درخت سب اللہ کے مطیع ہیں، اور آسمان کو اونچا کیا، اور اسی نے دنیا میں ترازو رکھ دی، تاکہ تم تولنے میں کمی بیشی نہ کرسکو، اور انصاف اور حق کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو، اور تول کو گھٹاؤ مت، اور اسی نے خلقت کے واسطے زمین کو اس کی جگہ پر رکھ دیا، کہ اس میں میوے ہیں اور کھجور کے درخت، جن کے پھل پر غلاف ہوتا ہے، اور اس میں غلہ ہے جس میں بھوسا ہوتا ہے اور اس میں غذا کی چیز بھی ہے، سؤاے جن وانس! تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ اسی نے انسان کو مٹی سے جو ٹھیکرے کی طرح بجتی تھی پیدا کیا اور جنات کو آگ سے پیدا کیا، سؤاے جن وانس! تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ وہ دونوں مشرق اور دونوں مغرب کا پیدا کرنے والا ہے اسی نے دو دریاؤں کو ملایا، کہ ظاہر میں باہم ملے ہوئے ہیں اور حقیقتاً ان کے درمیان ایک حجاب قدرتی ہے کہ دونوں بڑھ نہیں سکتے، سؤاے جن وانس! تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ان دونوں سے موتی اور مرجان نکلتا ہے، سؤاے جن وانس! تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے اور کشتیاں بھی اسی کی ہیں جو سمندر میں کھڑی ہوتی ہیں پہاڑوں کی طرح، سؤاے جن وانس! تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ جتنے ذی روح زمین پر موجود ہیں سب فنا

ہو جائیں گے اور صرف اللہ رب کی ذات باقی رہ جائے گی۔ سؤاے جن وانس! تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

اے گروہِ جن وانس! اگر تم ایسا کرسکتے ہو تو کر دکھاؤ کہ زمین وآسمان کی حدود سے باہر نکل جاؤ، لیکن نہیں نکل سکتے مگر سلطان سے، سؤاے جن وانس! تم اپنے ربّ کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔........"

سورۂ رحمٰن سننے کے بعد میں تھوڑا سا متاثر ہوا لیکن میرا مادہ پرست ذہن ہر بات کی نفی کر دیتا تھا۔ لہٰذا میں نے یوسف تشیک سے کہا۔ "تم نے جو کچھ بھی پڑھا ہے وہ صرف انسان کی غذا کے بارے میں ہے۔"

میری یہ بات سن کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پھر وہ قرآن کو بند کرتے ہوئے بولا۔ "تم مادہ پرست ہو۔ اس لئے تمہارا ذہن صرف غذا کی طرف گیا حالانکہ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک کی ضروریات کو بیان کردیا ہے۔ اس میں زمین وآسمان چاند وسورج، دن اور رات تک کے بارے میں تذکرہ بھی ہے۔"

زمین وآسمان، چاند وسورج، دن اور رات واقعی اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا۔ میں نے سوچا کہ اس سورۃ میں ان چیزوں کا ذکر تو کیا گیا ہے لیکن ان کا عمل کیا ہے اس بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں۔ لہٰذا یہ موقع اچھا ہے۔ دیکھیں سائنسی علوم کے بارے میں مذہب کا یہ رسیا کیا کہتا ہے۔

☆☆☆

ایٹم اور قرآن

یہ سوچ کر میں نے پوچھا۔ ''اللہ نے زمین و آسمان، چاند و سورج اور دن رات کا ذکر تو کیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ دن اور رات کی سائنسی حیثیت کیا ہے۔ اور یہ انسان ہی ہے جس نے زمین اور چاند و سورج کی گردش سے دن رات کا پتہ چلایا ہے۔''

''یہ کام انسان ہی کا تھا۔'' یوسف تشیک نے نہایت ملائم لہجے میں جواب دیا۔ ''اللہ نے انسان کو عقل دے کر اشرف المخلوقات بنایا ہی اسی لئے ہے کہ وہ اس کے احکامات سمجھے، ان کی تشریح کرے اور پھر ان پر عمل پیرا ہو جائے۔ اسی سورۃ میں ایک جگہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے چاند اور سورج حساب کے ساتھ چلتے ہیں۔ اور زمین کو خاص جگہ پر رکھ دیا۔ یہ خاص جگہ زمین کا وہی محوری جھکاؤ ہے۔ اب انسان نے ان احکامات کی مدد سے چاند، سورج اور زمین کی گردش کو معلوم کیا اور پھر دن رات کا عمل کس طرح ہوتا ہے انسان کے دور اندیش ذہن نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا۔''

''لیکن۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔۔ میں نہیں مانتا۔'' میں نے ڈھٹائی سے کہا۔'' کیوں کہ یہ بات تو قرآن میں آنے سے ہزار ہا برس قبل یونانی علماء نے بھی بتا دی تھی۔ بطلیموس اور ارسطو وغیرہ پہلے ہی اس بارے میں اظہار خیال کر چکے تھے۔''

''لیکن تم نے غور نہیں کیا۔'' یوسف تشیک نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ''ان کے نظریات اور ویسے ہی دوسرے تمام نظریات کو قرآن نے باطل قرار دیا ہے۔ بطلیموس اس کائنات کو حرکت پذیر قرار دیتا تھا جب کہ ارسطو حرکت ارض کو نہیں مانتا تھا۔ ان کے ان متضاد نظریوں پر قرآن نے زبردست چوٹ لگائی اور انسان جو طرح طرح کے شکوک وشبہات میں مبتلا رہتا تھا اس کو صاف بات بتا دی۔ قرآن کی یہی وہ حقیقت ہے جسے موجودہ دور کے دانشور جنہیں تم سائنس داں کہتے ہو، بھی تسلیم کرتے ہیں۔''

اس کا جواب سن کر میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ چھوٹے قد کا یہ چینی مسلمان علم میں مجھے اونچا۔۔۔۔۔۔ بہت ہی اونچا نظر آنے لگا۔ اب بارش تھم چکی تھی۔ عرشہ پر پھر پہلے ہی جیسی چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ میرے پاس اس موضوع پر بات کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے بات کا رخ بدلنے کے لئے کہا۔ ''بارش ختم ہو چکی ہے۔ چلو کینٹین میں چل کر کھانا کھاتے ہیں۔''

''میں عشاء کی نماز کے بعد کھانا کھاؤں گا۔'' یوسف تشیک نے جواب دیا۔

''اچھا۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا اور راجشیکی کا ہاتھ پکڑ کر کیبن سے باہر آ گیا۔

میری نظر میں یوسف تشیک ایک مذہبی جنونی شخص تھا جو میری ہر بات کا جواب اسلامی احکامات کی روشنی میں دیا کرتا تھا۔ اور مادہ کو سرچشمۂ حیات سمجھنے والوں کو دین کے ماننے والوں سے چڑ سی ہوتی ہے، یہی حال میرا تھا۔ میں بعض حقیقتوں کو مانتے ہوئے بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔

راجشی، وشگی، رمنا اور کئی ہم سفر دوست اس کی قابلیت سے متاثر تھے لیکن میری یہ کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس شخص کے ذہن سے مذہب کا لبادہ اتار دوں۔

میں اسے بحث تو نہیں کہہ سکتا لیکن سوال و جواب کا یہ سلسلہ کچھ اس طرح سے تھا کہ سننے والوں کے دلوں پر اسلام کی سچائی کا رعب بیٹھتا جا رہا تھا۔

ایک دوپہر جب کہ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے، میں وشگی اور اس کی بیوی کے ہمراہ عرشہ پر پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھا تھا۔ موسم نہایت ہی خوش گوار تھا۔ اور وشگی امریکہ کے رنگین حالات سنا رہا تھا۔ اس کی بیوی شیر خوار بچی سے کھیل رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ بھی بیچ میں بول کر اپنے شوہر کی کسی بات کی تائید کر دیا کرتی تھی۔

میں نے دیکھا کہ یوسف تشیک ٹہلتا ہوا آ رہا ہے۔ اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی کتاب تھی۔ اس کی اس بے وقت آمد سے نہ جانے کیوں میں جھنجھلا سا گیا۔ شاید میرا ذہن شکست خوردہ تھا۔ اس وقت کے دل چسپ موضوع کے یکلخت ختم ہونے سے میرے ذہن میں ناگوار تاثر سا پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے آتے ہی وشگی اور اس کی بیوی خاموش ہو گئے تھے۔

"کہو! کیا باتیں ہو رہی ہیں؟" اس نے ہی پوچھا۔ "اور ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔"

"امریکہ بڑا ہی رنگین ملک ہے۔" یوسف تشیک نے کرسی سے پیٹھ لگا کر اس طرح کہا جیسے وہ خود وہاں کا باشندہ ہو۔۔۔۔۔۔

"کیا تم نے امریکہ دیکھا ہے؟" وشگی نے نہایت ہی اشتیاق سے پوچھا۔

"نہیں، مجھے اتنی فرصت کہاں۔ اس نے مختصر سا جواب دیا۔"

"جب بھی فرصت ملے، امریکہ ضرور دیکھنا۔" میں نے طنز کیا۔ تمہیں مادہ کی حقیقت کا علم ہو جائیگا۔

"اس کے لئے کہیں گھومنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے خوش دلی سے جواب دیا۔ "مادہ کی حقیقت جاننے کے لئے "قرآن" کافی ہے۔"

"قرآن۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، قرآن!" اس نے مسکرا کر کہا۔ "مسلمان کو رہنمائی کے لئے کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں، بشرطیکہ وہ مسلمان ہو کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔:

"تم ہی غالب رہو گے اگر مسلمان رہو گے۔"

"گویا ترقی کے لئے مسلمان ہونا ضروری ہے!" میں نے پوچھا۔

"بالکل۔" اس نے آگے کو جھکتے ہوئے کہا۔ "کیوں کہ جب تک کوئی بھی شخص اسلام کی حقانیت تسلیم نہیں کرے گا، تو قرآن میں دیئے گئے احکاماتِ خداوندی کو نہیں سمجھ سکے گا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو تحقیق و جستجو کی دعوت دی ہے۔ کائنات کے مختلف مناظر مثلاً چاند، سورج، زمین، سیاروں، پہاڑوں، دن رات کے نظام، بنائے اور جانوروں کی پیدائش تک پر غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ اور پھر "وسخرلکم مافی والارض السمٰوٰت"

کہہ کر زمین و آسمان کی تمام اشیا کو تصرّف میں لانے کا حکم دیا ہے۔ جس دین کی یہ خوبیاں ہوں، جو دین خود علم کے دروازے کھول رہا ہو، اس کے پیروکار کو کسی اور کے پاس رہنمائی کی خاطر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اگر یہ بات ہے تو مسلمانوں نے سائنسی علوم میں ترقی کیوں نہیں کی؟"

میں نے پوچھا۔

"تمہارا خیال غلط ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "مسلمانوں نے نہ صرف سائنسی بلکہ انسانی زندگی کے ہر علم میں بے پناہ ترقی حاصل کی، وہ خلاء میں دیکھتے ہوئے بولا۔ قدیم یونان میں بقراط نے جو کچھ دریافت کیا۔ ارسطو کا دور ۳۲۲ ق م سے ۳۴۴ ق م تک گنا جاتا ہے اس نے بھی معلومات فراہم کیں۔ یونانی فلسفیوں نے نظام پر غور کیا۔ لیکن یہ سب ان کے اپنے دماغ کی پیداوار تھی جس نے جو سمجھا وہی کہہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ کلیسا نے ان کو مورِدِالزام ٹھہرایا۔ اور ان میں سے بیشتر کو زہر کا سامنا کرنا پڑا۔ اور یوں سائنسی زبان میں تاریکی کے دور کا آغاز ہوا اور یہ دور ظہورِ اسلام تک تاریک ہی رہا۔

مسلمانوں نے پہلی صدی ہجری سے ہی ترقی کی راہ میں حائل سیاہ چادر کو پاش پاش کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ ان کا دین عاقبت سدھارنے کی ترغیب دیتا تھا۔ اور اس کی بنیاد اس دنیاوی زندگی پر رکھی گئی ہے۔ ان کا پیغمبر اللہ کا جو حکم ان تک پہنچاتا تھا اس میں نہ صرف زندگی گزارنے کا طریقہ ہوتا تھا بلکہ اس حکم میں کائنات میں تصرّف کا طریقہ بھی ہوتا تھا۔

ہسپانیہ اور بغداد کی درس گاہیں اسلامی تمدن کا جیتا جاگتا ثبوت تھیں۔ یہ مادی اور روحانی علم کا ایسا منبع تھیں جس سے ساری دنیا فیض اٹھاتی تھی۔ اور آج بھی ہمارے اسلاف کے پیش کردہ اکثر نظریات پر سائنس ترقی کر رہی ہے۔ اور ہمارے اسلاف کے نظریات یہی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بیان فرما دیئے

ہیں۔"

اس کی یہ لمبی چوڑی بات سن کر مجھے شرارت سوجھی میں نے سوچا کہ یہ شخص تو نہایت ہی چالاک ہے کہ موجودہ ترقی کو بھی قرآن کی مرہون منت قرار دے رہا ہے۔ لہٰذا اس سے ایسا سوال سائنسی ترقی ہی کے ناطے سے کیا جائے جس کا یہ جواب نہ دے سکے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے کئی سال گزر چکے تھے لیکن دنیا میں اس کی بازگشت ابھی تک سنائی دے رہی تھی۔ لوگ ایٹم بم سے خوف زدہ تھے لیکن 'ایٹم سے' ناواقف تھے۔ میں نے اسی کے متعلق سوال کرنا مناسب سمجھا۔

'قرآن میں ایٹم کے بارے میں ذکر ہے؟" میں نے پوچھا۔

میری بات سنتے ہی وشگی اور اس کی بیوی میرا منہ تکنے لگے۔ ان کے خیال میں یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب یوسف تشیک نہیں دے سکتا تھا۔ اور میرا یہ سوال اس موضوع سے قطعی غیر متعلق تھا۔ یوسف تشیک نے ایک لحہ ہم سب کے چہرے پر نظر ڈالی اور پھر بڑے ہی اطمینان سا بولا۔

"قرآن میں ایٹم کے بارے میں ارشاد موجود ہے۔"

قرآن میں ایٹم کے بارے میں ذکر ہے! میں نے اور وشگی نے ایک ساتھ حیرانی سے پوچھا۔

"قرآن میں سب کچھ ہے۔ جب ہی تو اسلام کو مکمل دین کہا جاتا ہے۔" اس نے بڑے ہی اطمینان سے جواب دیا۔ "تم سورۂ فیل پڑھو۔" اس نے مجھے اشارہ کیا اور پھر خود ہی سورۂ فیل کی تلاوت کرنے لگا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے۔

الم تر کیف فعل ربک با صحب الفیل o

کیا آپ کو معلوم نہیں آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا۔

الم یجعل کید ھم فی تضلیلo

کیا ان کی تدبیر کو (جو ویرانی کعبہ کے بارے میں تھی) غلط نہیں کر دیا۔

وارسل علیھم طیراً ابا بیل o

اور ان پر غول کے غول ابابیلوں کے بھیجے۔

ترمیھم بحجارۃً من سجیلo

جو ان پر پتھر کی کنکریاں پھینکتے تھے

فجعلھم کعصف ما کولo

اور اللہ تعالیٰ نے ان کو سوکھے ہوئے بھوسے کی مانند پامال کر دیا۔"

"اس سورۃ میں تو ہاتھیوں اور ابابیلوں کا ذکر ہے۔"

تلاوت ختم ہوتے ہی میں نے کہا۔

"تم تاریخ عالم کا مطالعہ کرو گے تو اس واقعہ کی اہمیت اور حقیقت سے واقف ہو جاؤ گے۔" یوسف تشیک نے جواب دیا۔ "اگر کوئی شخص حقیقتاً ذات الٰہی کے بارے میں جاننا چاہتا ہے تو تم یقین جانو، اس زمین پر ایسی نشانیاں موجود ہیں جن سے اس کائنات کے خالق کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ اور یہ مادہ پرستوں کے لئے واضح ثبوت ہے۔"

"میں نے تم سے ایٹم کے بارے میں پوچھا تھا، میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اپنا سوال یاد دلایا۔"

"پہلے تم واقعہ سن لو۔ پھر تمہارے سوال کا جواب بھی مل جائے گا۔" اس نے کہا۔

یہ بات سن کر میں، وشگی اور اس کی بیوی پوری طرح متوجہ ہو گئے۔

"سنو!" وہ میز پر تسبیح رکھ کر بولا۔

انسان شروع ہی سے مادہ پرست ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے، وہ جو کچھ سنتا ہے اور جو کچھ محسوس کرتا ہے، اسی کو حقیقت سمجھتا ہے۔ جبکہ ذاتِ الٰہی پوشیدہ ہے اور پوشیدگی ہی ایمان کی کسوٹی ہے۔ قیامت کے دن اس کسوٹی ہی کی بنیاد پر اعمال کی جانچ ہوگی۔ لیکن پھر بھی انسان کو گمراہی سے بچانے کی خاطر حق تعالیٰ نہ صرف پیغمبروں کو بھیجتا رہا ہے بلکہ اکثر و بیشتر اپنی قدرت کا مظاہرہ بھی کرتا رہا ہے۔

کبھی آتشِ نمرود کو گلستاں بنایا اور کبھی موسیٰ کے عصاء نے اژدہا بن کر بڑے بڑے سانپوں کو نگل لیا، اور شیطان جو کہ ازل سے انسان کا دشمن ہے ہمیشہ اسے مادہ پرست بنانے کی کوشش میں مصروف رہا۔ شیطان مادہ پرستی کا ایسا درس دیتا ہے کہ اس کے دل و دماغ سے مذہب اور روحانیت کی قدر و منزلت ختم ہو جاتی ہے۔

اتنا کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکا اور پھر ہم سب کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

"مادہ پرست آدمی موت کو محض طبعی حادثہ کہتا ہے۔ دوبارہ جی اٹھنے کو مذاق سمجھتا ہے جہنم یا دوزخ کو وہم خیال کرتا ہے۔ جب یہ اور اسی طرح کی تمام باتیں

خواب بن جاتی ہیں تو پھر وہ اپنے آپ کو سب کچھ سمجھنے کے خیال میں مبتلا ہو جاتا ہے۔جس کے نتیجے میں وہ مظاہرِ قدرت سے بھی ٹکرانے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔
اور یہی شیطان کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

شیطان آدم کو اپنا میڈیم بنا کر اللہ سے جتنی بھی لڑائیاں لڑ چکا ہے وہ سب مضحکہ خیز اور عجیب نوعیت کی ہیں۔یوسف تشیک خلا میں ہاتھ لہرا کر بولا۔اگر ان معرکوں پر غور کیا جائے تو درسِ عبرت حاصل ہوتا ہے۔اور عقل بھی حیران رہ جاتی ہے کہ مٹی کا یہ پتلا شیطانی زعم کے سہارے پروردگار سے کس طرح پنجہ آزمائی کرتا ہے۔
اور ہر دفعہ مات کھانے کے بعد بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا اُجالا لینے کے بعد پھر اپنی پرانی روش پر چل نکلتا ہے اور شیطان کے بہکانے میں آتا ہے،

مادہ پرستی کی زرّہ پہنتا ہے۔

اللہ کے بنائے ہوئے قوانین سے ٹکراتا ہے۔

مادہ پرستی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بطور نشانی اس ارض خاکی پر اپنا گھر بنانے کا فیصلہ کیا تاکہ انسان آنکھوں سے اس کی حقیقت دیکھ لے اور براہِ راست رحمتوں اور برکتوں سے فیض یاب ہو سکے۔

اس عظیم مقصد کی خاطر اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کا انتخاب کیا۔اور اس مقدس گھر کی تعمیر کے لئے عرب کے ایک سادہ صحرا کا انتخاب کیا۔ان دونوں عظیم پیغمبروں نے چاہِ زمزم کے قریب ہی اس مقدس گھر کو تعمیر کیا۔پھر اللہ تعالیٰ نے ہر امت پر اس کی تعظیم ضروری قرار دی۔
یہ سب کچھ اس وجہ سے کیا گیا۔یوسف تشیک اپنے الفاظ پر زور دے کر

بولا۔کہ انسان ذاتِ الٰہیٰ سے منکر ہونے کی بجائے اس کی رحمتوں اور برکتوں سے فیض یاب ہو کر اس کا اطاعت گزار بندہ بن جائے اور ابلیس کے بہکانے میں نہ آئے۔“

”لیکن، آدمی کتنا کم عقلمند ہے، اس نے اس ہی خانۂ خدا کو بتوں سے سجادیا۔اور ذاتِ الٰہیٰ کے بجائے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے بتوں کو پوجنے لگا۔“

”لیکن، میرے رب کی کیا شان ہے“ وہ نہایت عقیدت و احترام سے بولا۔” آدمی کی اس شیطانی حرکت کے باوجود رحمتِ الٰہیٰ میں ذرّہ برابر فرق نہیں آیا۔حالانکہ اس سے قبل ایسی حرکتیں کرنے والوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔“

کیونکہ۔۔۔۔یہیں سے ہدایاتِ ربانی کا سورج طلوع ہونا تھا۔

کیونکہ۔۔۔۔یہیں سے حق و صداقت کی کرنیں پھوٹنا تھیں۔

کیونکہ۔۔۔۔یہیں سے نورِ نبوّت کو اجاگر ہونا تھا۔

لیکن، جب ایک مغرور و سرکش مادہ پرست نے یہ شیطانی عزم کیا کہ اللہ تعالیٰ کی اس ارضی علامت یعنی خانہ کعبہ کو منہدم کر دے تو قہرِ الٰہیٰ نے ان سب کو چاٹ لیا اور ان طاغوتی قوتوں کی کوئی علامت باقی نہیں رہنے دی۔یوسف تشیک نے نہایت ہی گرجدار آواز میں کہا۔

ہم سب بدستور اس کی طرف متوجہ تھے۔اس کا اندازِ بیان ہمیں بولنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ دوبارہ بولا۔

”عرب کے قریب ہی ملک یمن واقع ہے۔وہاں کا مختارِ اعلیٰ ابرہہ تھا۔

جب اس نے دیکھا کہ ہر سال لوگ جوق در جوق زیارت کعبہ کو جاتے ہیں تو اس کے دل میں آتشِ نمرود بھڑک اٹھی، وہ حسد سے جل اٹھا اور اس نے اپنے بادشاہ نجاشی سے کہا۔"

"کیوں نہ حج کا بندوبست اپنے ہی ملک میں کر دیا جائے۔ لوگ دکھ سہتے، تکلیفیں اٹھاتے زیارتِ کعبہ کی خاطر مکّہ جاتے ہیں۔ یہاں کعبہ بن گیا تو لوگ بہ آسانی پہنچ جایا کریں گے۔"

نجاشی، جو ملک حبشہ کا بادشاہ تھا، اپنے گورنر کی بات سن کر بہت خوش ہوا اور اس تجویز کو معقول قرار دیتے ہوئے ایک نیا کعبہ بنانے کی اجازت دے دی۔

"اس ناپاک مقصد کی خاطر" یوسف تشیک نہایت نفرت سے بولا۔ ابرہہ نے بیت المقدس، اور آس پاس کے علاقوں میں مقیم ماہرینِ فنِ تعمیر کو بلایا اور ایک نہایت ہی عالیشان عمارت سرخ، سبز اور زرد رنگ کے پتھروں کی بنوائی پھر اس کے چاروں جانب نہایت ہی قیمتی ہیرے جواہرات لگوائے۔ اور اطلس و کمخواب کے پردوں سے ڈھانپ دیا۔

اب نقلی کعبہ تیار تھا۔

شیطانی عزم سینہ تانے کھڑا تھا۔

پھر اس نے اہلِ یمن اور قرب و جوار میں رہنے والوں کو حکم دیا کہ وہ مکّہ جانے کے بجائے اس کعبہ کی زیارت کیا کریں جو رعایا اس کی اطاعت گزار تھی ان لوگوں نے دو تین سال اس نقلی کعبہ کا طواف کیا لیکن ان کے دلوں میں جو اصل کعبہ کی محبت اور عقیدت قائم تھی وہ کسی طرح کم نہ ہوئی۔ ان ہی دنوں ایک عربی یمن گیا اور

ابرہہ سے مل کر اس کا متولی بن گیا۔ در حقیقت یہ عربی خانہ کعبہ کے مقابلے پر بنائے گئے باطل کے خانہ کعبہ کی حرمت مٹانے آیا تھا تا کہ لوگ گمراہ نہ ہوں اور ابرہہ کو بھی معلوم ہو جائے کہ انسان کے دلوں میں جو محبت اور عقیدت مکّہ میں واقع خانۂ خدا کی ہے وہ کسی اور مقام کو نہیں حاصل ہو سکتی۔ لہٰذا کچھ دنوں بعد اس عربی نے ابرہہ کے بنائے ہوئے کعبہ میں کہیں سے گندگی لا کر رکھ دی اور خود رات کی تاریکی میں وطن واپس لوٹ گیا۔

"بڑا ہی دلچسپ واقعہ ہے۔" وشگی جو بڑی توجہ سے سن رہا تھا، بولا۔

"دلچسپ بھی اور عبرتناک بھی۔" یوسف تشیک نے جواب دیا۔ اور دوبارہ واقعہ سناتے ہوئے بولا۔

ابرہہ کو جب اس نازیبا حرکت کا علم ہوا تو غضبناک ہوا اور اس نے فیصلہ کیا کہ مکّہ جا کر ان کو نیست و نابود کر دے تا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اپنے اس ناپاک ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس نے ایک لشکرِ جرار تیار کیا۔ اور خانہ کعبہ کو منہدم کرنے کے لئے اس زمانے کے "بلڈوزر" یعنی ہاتھیوں کو جمع کیا۔ یہ واقعہ سخت گرمیوں میں پیش آیا جب دور دور کسی جاندار کا ملنا محال ہوتا ہے۔

اہلِ مکّہ نے ایک صبح دیکھا کہ آبادی کے باہر حبشہ کے گورنر ابرہہ کا لشکر خیمہ زن ہے۔ اور دور تک سیاہ پہاڑ جیسے جانوروں کے غول در غول گھوم رہے ہیں۔ انہوں نے جب اس لشکر کی آمد کا حال جاننا چاہا تو معلوم ہوا کہ ابرہہ خانہ خدا کو مسمار کرنے آیا ہے۔ وہ کعبہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتا ہے۔ اس نے اہلِ مکہ کی طاقت کا اندازہ لگانے کے لئے ان کے چرتے ہوئے مویشیوں کو پکڑ لیا۔ اس وقت

کوئی باقاعدہ حکومت نہیں تھی۔ سرداری نظام رائج تھا۔ اہل مکہ تیغ زنی میں کسی سے کم نہ تھے۔ شجاعت ان کی میراث تھی لیکن یہاں مقابلہ انسانوں کی بجائے دیوہیکل جانوروں سے تھا۔ اور جانور بھی ایسے تھے کہ مکہ والوں نے اس سے قبل دیکھے ہی نہ تھے۔

انہوں نے مقابلہ کرنے کے بجائے صلح وصفائی کے ذریعے اپنے مویشی حاصل کرنے میں ہی بھلائی سمجھی اور اس مقصد کی خاطر سردار عبدالمطلبؓ کو ابرہہ کی طرف بھیجا گیا۔ حضرت عبدلمطلب صرف قبیلہ قریش کے سردار ہی نہیں تھے بلکہ وہ خانہ کعبہ کے متولی بھی تھے۔ اور اس عزاز کی وجہ سے آپ سارے مکّہ میں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔

ابرہہ ایک نہایت ہی وسیع اور خوشنما خیمہ میں طلائی پر بیٹھا تھا۔ یوسف تشیک نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے دائیں اور بائیں جانب یمن کی حسین ترین کنیزیں سونے کی صراحیوں میں شراب لئے کھڑی تھیں۔ اس کے سامنے کی جانب یمن کے مضبوط جسموں والے جوان آلات حرب جسموں پر سجائے دورویہ قطاروں میں کھڑے تھے۔ ابرہہ کے ہاتھوں میں موتیوں سے جڑا ایک پیالہ تھا اس میں سے اس کی منظورِ نظر کنیز وقفہ وقفہ سے شراب پی رہی تھی۔

غرض کہ اس کا یہ مختصر سا دربار پوری طرح شیطانی آلات سے آراستہ تھا۔ سردار عبدالمطلب سبز فرغل میں سر پر سفید عمامہ باندھے، دربار پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ آپ کا چہرہ ہر قسم کے تاثر سے خالی

تھا۔ ابرہہ کو توقع تھی کہ مکہ کا یہ ذی حیثیت سردار اس کے پاؤں پر سر رکھ کر خانہ کعبہ کی سلامتی کی بھیک مانگے گا۔ مکہ کے سرداروں کے ذریعے درگزر اور رحم کی التجا کرے گا لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔

''حضرت عبدالمطلب نے نہایت پروقار لہجے میں کہا اے بادشاہ! ہم تجھ سے لڑنا نہیں چاہتے۔ تیرے سپاہیوں نے ہمارے مویشی پکڑ لئے ہیں۔ انہیں چھوڑ دے۔''

ابرہہ نے حضرت عبدالمطلب کا مدعا سن کر نہایت حیرت سے کہا۔ ''تمہیں دیکھ کر میں نے سمجھا تھا کہ تم ایک باشعور فرد ہو گے۔ لیکن تمہارے اس مطالبہ نے ہمیں مایوس کر دیا۔'' پھر اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔ ''تم مویشیوں کی واپسی کا مطالبہ کر رہے ہو لیکن خانہ کعبہ کا نام تک نہیں لیتے جسے میں مسمار کرنے آیا ہوں۔''

حضرت عبدالمطلب نے دونوں ہاتھ سینہ پر باندھ کر نہایت تمکنت سے جواب دیا۔ ''میں مویشیوں کا مالک ہوں۔ خانہ کعبہ کا نہیں۔ خانہ کعبہ کا مالک اللہ ہے وہی اسے بچائے گا۔''

یہ جواب سن کر ابرہہ نے ایک زوردار شیطانی قہقہہ لگایا اور نہایت ہی غرور سے بولا۔ ''خانہ کعبہ کو مجھ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔''

''پھر تم جانو اور وہ جانے۔'' حضرت عبدالمطلب نے نہایت ہی سکون سے جواب دیا۔ ''مجھے مویشی واپس کر دو۔''

ابرہہ نے حضرت عبدالمطلب کے اس معصومانہ مطالبہ کو منظور کر لیا اور مویشی واپس کر دیے۔

اور پھر، یوسف تشیک اپنے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولا، حضرت عبدالمطلب مویشیوں کو لئے ہوئے واپس آئے اور اہل مکہ کو جمع کر کے بولے:

لوگو! فوراً ہی پہاڑوں میں پناہ لے لو کیونکہ تاریخ ایک بار پھر خود کو دوہرا رہی ہے۔ نمرود نے اللہ سے جنگ کی تھی اور اللہ کے بھیجے ہوئے مچھروں کی فوج سے ہلاک ہوا تھا۔ اب ابرہہ نے اللہ کی حرمت مٹانے کا فیصلہ کیا ہے اور نہ جانے یہ معرکہ کس قسم کا ہو۔ لہٰذا تم سب پہاڑی غاروں میں پناہ لے لو۔

حضرت عبدالمطلب کی بات سن کر اہلِ مکّہ اپنے بیوی اور بچوں کے ساتھ پہاڑوں کی طرف دوڑ پڑے۔ جب پوری بستی خالی ہوگئی تو حضرت عبدالمطلب صحن کعبہ میں آئے اپنے دونوں ہاتھوں کو آسمان کی جانب بلند کیا، اور خانہ کعبہ پر نظریں جما کر یوں دعا کی:

''اے اللہ! بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے، تو بھی اپنے گھر کو بچا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ صلیب غالب آجائے اور کوئی تیرا نام لیوا نہ رہے۔''

اس دعا کے بعد آپ نے غلافِ کعبہ پکڑ کر گریہ وزاری کی اور پھر خود بھی پہاڑی غاروں میں چلے گئے۔

دوسری صبح جب ابرہہ نے خانہ کعبہ کو ڈھانے کی غرض سے ہاتھیوں کی صفوں کو درست کیا تو اسے یہ جان کر ازحد خوشی ہوئی کہ مکہ کے لوگ اس سے خوف زدہ ہو کر بستی ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ باطل کا یہ متوالا، مادہ کا دیوانہ آنیوالے حالات سے قطعی بے خبر تھا۔ اس نے فیل بانوں کو حکم دیا کہ دور سے ہاتھیوں کو دوڑاتے ہوئے لائیں اور خانہ کعبہ سے ٹکرادیں۔

اس مقصد کی خاطر ہاتھیوں کے سروں پر آگے کی جانب فولاد کے نوک دار خول پہلے ہی چڑھا دیئے گئے تھے۔ شاید تم نہیں جانتے، یوسف تشیک نے پوچھا۔ پھر اپنے الفاظ پر زور دے کر بولا، ہاتھی غول کے ساتھ رہتا ہے اور اس غول کا ایک سردار بھی ہوتا ہے۔ سردار جو بھی حرکت کرتا ہے باقی ہاتھی بھی وہی حرکت کرتے ہیں۔ ابرہہ کے ان ہاتھیوں کا بھی ایک سردار تھا جسے ابرہہ بہت ہی محبوب رکھتا تھا۔ وہ ہاتھی بڑا ہی قدآور اور قوی تھا۔ اسے سونے چاندی کے زیورات پہنائے جاتے تھے۔

کعبہ کو ڈھانے میں پہل اسی کو کرنا تھی۔ لیکن اسے جب بھی کعبہ کی طرف ہانکا جاتا تو بیٹھ جاتا۔ اور اگر کسی دوسری سمت میں موڑا جاتا تو دوڑنے لگتا۔

ابرہہ اس اشارۂ خداوندی کے باوجود اپنے شیطانی ارادے سے باز نہیں آیا۔ اس نے فیل بانوں کو سختی سے حکم دیا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے ان بلڈوزروں کی مدد سے کعبہ کو ڈھادیا جائے۔

فیل بانوں نے آنکس مار مار کر ہاتھیوں کو زخمی کر دیا لیکن وہ اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلے۔

قدرت اس کی نادانی پر مسکرا رہی تھی، ذات الٰہی درگزر کر رہی تھی۔ اس کے لئے ابھی توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوا تھا۔

لیکن، جب وہ اس بے بسی کے عالم میں بھی اپنے شیطانی ارادے سے باز نہیں آیا تو ذات باری تعالیٰ نے اس گستاخ کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا۔

یوسف تشیک نہایت ہی جذباتی انداز میں بولا۔ آسمان پر سیاہ بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نمودار ہوا، جو آہستہ آہستہ ان گستاخوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ان سے کسی نے بھی اس سیاہ ٹکڑے کی جانب توجہ نہ دی۔ وہ سب اپنے شیطانی عمل کی تکمیل میں

لگے ہوئے تھے۔ یہ دراصل چھوٹے چھوٹے پرندوں کا غول تھا جنہیں ابابیل کہا جاتا ہے۔ جوں ہی یہ پرندے ان کے سروں پر پہنچے انہوں نے ایک نظر اوپر اٹھا کر دیکھا۔

''ہونہہ، یہ پرندے تو اڑتے ہی رہتے ہیں۔'' اس نے لاپروائی سے کہا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

یہ چھوٹے چھوٹے پرندے گول دائرے کی شکل میں ان کے سروں پر چکر کاٹنے لگے اور سمندر کی جانب سے اسی طرح کے جھنڈ کے جھنڈ آ کر ان میں شامل ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اور جب ان کی کثرت سے زمین پر سایہ ہو گیا تو لوگوں کو تشویش ہوئی۔

اتنے ڈھیر سارے پرندے صحرا میں کہاں سے آ گئے، انہوں سوچا۔

☆☆☆

سمندر میں آگ

پرندوں نے ایک مخصوص انداز سے سارے لشکر کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ہر پرندے کے پاس تین تین کنکریاں تھیں۔ ایک ایک دونوں پنجوں میں اور ایک چونچ میں۔ یہ خدائی ائرفورس تھی۔ یوسف تشیک میز پر ہاتھ مار کر بولا۔ ارشاد خداوندی ہوا اور پرندوں نے کنکریاں گرانی شروع کر دیں۔ یہ کنکریاں کیا تھیں، بم تھیں۔ جس پر بھی پڑتیں آر پار ہو جاتیں۔ ہاتھیوں کے جسم کو انہوں نے کھائے ہوئے بھس کی طرح کر ڈالا۔ وہ سر چھپانے کو بے تحاشہ بھاگتے تھے لیکن ان کی موت نے انہیں کہیں بھی نہیں چھوڑا۔ پرندے انہیں کہیں نہ کہیں تلاش کر کے ان پر کنکریاں پھینک ہی دیتے تھے۔ سپریم پاور، اللہ کی نازل کردہ اس صعوبت سے نہ بچ سکا۔ ابرہہ اور اس کا لشکر نیست و نابود ہو گیا۔ اور بالآخر شیطان یہ جنگ بھی ہار گیا۔ قرآن پاک میں سورہ فیل اس ہی واقعہ کے بارے نازل ہوئی ہے۔ اتنا کہہ کر یوسف تشیک نے گہری سانس لی اور خاموش ہو گیا۔

میں نے بھی واقعہ فیل تاریخ میں پڑھا تھا۔ لیکن اس وقت یوسف تشیک نے جس تفصیل اور انداز میں بیان کیا تھا، وہ نہایت ہی دل چسپ تھا۔

اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے کہا۔ ''تم نے میری بات کا تو جواب دیا ہی نہیں۔''

"اس واقعہ کو بیان کرنے کا مطلب تمہاری بات کا جواب دینا ہی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا پھر گلا صاف کر کے بولا۔ "سب سے پہلے ہمیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ "ایٹم" کیا ہے۔"

"ایٹم مادہ کی ناقابل تقسیم شکل کو کہتے ہیں۔" میں نے فوراً جواب دیا۔

"اور مادہ کی یہ آخری شکل ہی اس کی اصل قوت ہے۔" یوسف تشیک بولا۔ "اب ذرا غور کرو" اس نے میری طرف جھکتے ہوئے کہا۔ "اس واقعہ کے آخر میں ابابیل پرندے کا ذکر ہے اور یہ پرندہ جسامت میں چڑیا سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔

"ہاں، ہوتا ہے۔" میں نے اس کی تائید کی۔

"اب اس چھوٹے سے پرندے کے پنجوں اور چونچ میں جو کنکریاں ہوں گی وہ یقیناً نہایت چھوٹی ہوں گی۔" یوسف تشیک اس انداز سے بولا۔ "بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ان پرندوں نے جو کنکریاں اٹھا رکھی تھیں وہ مادے کی اصل قوت تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب یہ کنکریاں ہاتھی جیسے قوی ہیکل جسموں پر گریں تو ان کے پرخچے اڑ گئے۔ یہی مادہ کی اصل قوت تھی۔ یہی ایٹم کا زور ہے۔"

اس نے بات ختم کر کے کرسی سے ٹیک لگالی۔ ایٹم کی یہ مختصر سی تعریف سن کر میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ وشگی اور اس کی بیوی بھی اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"شاید میں تمہاری مجلس میں دخل انداز ہوا۔" اچانک اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں اس کی معافی چاہتا ہوں۔" اس نے میز پر سے تسبیح اٹھا کر کہا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا راہداری کی جانب چل دیا۔

میں، وشگی اور اس کی بیوی گم سم بیٹھے اسے جاتا دیکھتے رہے۔

رات دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔

میرے کیبن میں صرف دو آدمیوں کی جگہ تھی۔ مگر اس میں پانچ آدمی جمع تھے۔ وشگی اس کی بیوی، راجیشی، میں اور چینی مسافر یوسف تشیک۔

ہم لوگوں نے وقت کاٹنے کی خاطر تاش کھیلنا شروع کر دیئے۔ کھیل کے دوران خوب ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ یوسف تشیک ہم سے جدا ایک کونے میں دبکا بیٹھا ہوا تھا۔ البتہ مذاق میں کبھی کبھی وہ بھی کوئی بات کہہ دیتا تھا۔

آدھی رات گزرنے کے بعد، تمام دوستوں پر نیند نے غلبہ پانا شروع کر دیا۔ سب نے تاش کھیلنا بند کر دیا اور سب نے سمٹ سمٹا کر اپنے لیے جگہ بنالی۔

میں نے کونے میں پڑے ہوئے اسٹول پر قبضہ کیا اور دوسرے کونے کی دیوار سے پاؤں پھیلا کر ٹکائے۔ راجیشی نے اپنے کیبن میں جاتے ہوئے میرے کیبن کی بتی بجھادی، میں غالباً سو گیا تھا۔ میری آنکھ ایک جھٹکے سے کھل گئی۔ یہ جھٹکا جہاز کو لگا تھا۔ جیسے وہ چلتے چلتے اچانک رک گیا ہو۔ میرے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ کیبن میں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے فوراً اپنی ریڈیم گھڑی پر نظر ڈالی جس کی چمکتی ہوئی سوئیاں چار کے ہندسے کی طرف جا رہی تھیں۔ میں نے سوچا یہ جھٹکا کیسا تھا۔ کیا جہاز پھر کسی سے ٹکرا گیا! لیکن نہیں۔ یہ جھٹکا اس جیسا نہیں تھا بلکہ یہ مختلف سا تھا۔ پہلے میں اسے اپنا وہم سمجھا، لیکن نہیں، یہ وہم نہیں تھا۔ مجھ پر اس وقت ایک غنودگی سی طاری تھی۔ ذہن صحیح طور پر کام نہیں کر رہا تھا۔ اس کے باوجود کیبن سے باہر عجیب سا شور سنائی دے رہا تھا۔ میں کان لگائے شور سنتا رہا۔ جلد ہی یہ شور بلند ہوتا

چلا گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جہاز کے تمام مسافر جاگ اٹھے ہیں۔ اور ناگہانی آفت سے دوچار ہیں۔

میں فوراً ہی دریافتِ احوال کے لئے اسٹول سے اُٹھا اور کیبن کا دروازہ کھولنے ہی والا تھا کہ ایک لرزہ خیز دھماکہ سنائی دیا۔ جس سے کیبن کا فرش اور دیواریں اس زور سے ہلیں کہ اس میں رکھی ہوئی تمام چیزیں زیروزبر ہوگئیں۔

تمام ساتھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ پھر کسی نے چلا کر کہا کہ ''یہ شور کیسا ہے؟''

میں نے جواب دینے کے بجائے تیزی سے آگے جاکر دروازہ کھولا۔ یخ بستہ ہوا کا ایک تیز جھونکہ میرے جسم سے ٹکرایا۔ میں سردی کی پرواہ کیے بغیر قمیض اور پینٹ میں ہی تاریک راہداری میں دوڑ پڑا۔

اب میں دوسرے درجہ کی حد سے باہر مردوں اور عورتوں کے چیخنے کی آوازیں سن رہا تھا۔

''لوگ، آگ لگ گئی ہے۔۔۔۔۔آگ'' کا شور مچا رہے تھے۔

میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ درجۂ اوّل کی جانب سے آگ کے اونچے اونچے شعلے اور سیاہ دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔ دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے اور مسافروں کی چیخ وپکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

چندمنٹ تک میں پتھر کے بت کی مانند منہ اٹھائے آگ کے شعلوں کو دیکھتا رہا۔

لوگ اندھیرے میں ایک دوسرے سے الجھتے، ٹکراتے، گرتے پڑتے اور اوپر سے نیچے آجارہے تھے۔ سارے جہاز میں شور غل اور افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے دیکھا کہ ایک عورت اپنے معصوم بچے کو سینے سے چمٹائے میرے قریب سے گزری۔ اس نے اونچی ایڑی کی جوتی پہن رکھی تھی۔ یکا یک اس عورت کا پیر لڑکھڑایا اور وہ دھڑام سے نیچے گر پڑی۔

بچے کے رونے کی آواز اور اس عورت کی آواز ''ہائے میرا بچہ'' کبھی نہیں بھول سکتا۔

اس وقت نفسانفسی کا یہ عالم تھا کہ اس عورت اور بچہ کو کسی نے بھی اٹھانے کی کوشش نہ کی۔ نیچے گری ہوئی عورت بے بسی کے ساتھ اپنے جسم کو چھپانے کی کوشش کررہی تھی۔

میں نے ایک لمحہ سوچا اور پھر اسے اٹھانے کی خاطر آگے بڑھا۔ لیکن پیچھے سے بہت سے آدمیوں کا ریلا آیا اور میں کہیں سے کہیں جا پہنچا۔

آگ جہاز کے درمیانی حصے میں لگی تھی۔

میرے کانوں میں نسوانی اور مردانہ آوازیں گونج رہی تھیں۔ وہاں میں نے ایک نوعمر انگریز لڑکی کو دیکھا۔ وہ رورو کر اپنی ماں کو آوازیں دیتی پھر رہی تھی۔

عملے کے لوگ مسافروں سے بے نیاز آگ بجھانے میں مصروف تھے لیکن سمندر کی تیز ہوا کے سامنے ان کا کچھ بس نہیں چل رہا تھا۔ آگ بجھانے کے کئی موٹر سرگرم عمل تھے۔ سمندر کی سرد ہوا آگ کو دوبارہ بھڑکا دیتی تھی۔ اور اس طرح آگ ہر لحظہ بڑھتی جارہی تھی۔

رات کی تاریکی میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سمندر کے بیچ میں ایک بڑا سا چراغ روشن کردیا گیا ہو۔ جہاز میں جوں جوں آگ بڑھتی جارہی تھی، مسافروں میں

اسی سرعت سے بے چینی اور خوف و ہراس پھیلتا جارہا تھا۔

اول، دوئم اور سوئم درجے کا امتیاز ختم ہو چکا تھا اول درجے کے مسافر جن کی اکثریت یورپین تھی اور وہ یقیناً صاحبِ دولت لوگ تھے بھاگ بھاگ کر تیسرے درجے کے عرشے پر پناہ لے رہے تھے۔ اسی شور وغل میں مجھے ایک آواز سنائی دی۔ کوئی پوری قوت سے چیخ رہا تھا۔ ''مجھے بچاؤ۔۔۔۔ مجھے بچاؤ۔۔۔۔ پانی۔۔۔۔ پانی۔۔۔۔ پانی''

شعلے اگلتی آگ کی روشنی میں اس شخص کا جسم سرخ نظر آرہا تھا۔ میں نے اس کی جانب نظریں جمادیں۔ وہ منہ کے بل گرا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ شخص بدحواسی کے عالم میں کسی اونچی جگہ سے گر پڑا تھا۔ میں نے دیکھا۔ میں نے پہچان لیا۔ وہ میرا بحری دوست وشگی تھا۔ میں مجمع میں سے راستہ بناتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ اور جب بڑی مشکل سے اس کے پاس پہنچا تو وہ دم توڑ چکا تھا۔

مجھے اس کی بیوی اور بچے کا خیال آیا۔ میں نے ہجوم پر نظر دوڑائی لیکن وہ مجھے کہیں بھی نظر نہیں آئے۔

جہاز کے عرشے پر ایک قیامت برپا تھی۔

ہندوستانی، یورپین اور دوسرے مختلف ممالک کے مرد، عورتیں اور بچے سبھی یہاں موجود تھے۔ برقعہ پوش خواتین بچوں کو سینے سے چمٹائے ہوئے رو رہی تھیں اور گڑگڑا کر خدا سے یہ آفت ٹل جانے کی دعا مانگ رہی تھیں۔ جب کہ دوسری خواتین اور بچے بلک بلک کر رو رہے تھے۔ حواس باختہ مرد گم سم کھڑے آگ کے شعلوں کو دیکھ رہے تھے۔

اب آگ نے تیزی سے دوسرے عرشے کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جہاز کے خلاصی اور دوسرے یورپین افسر پاگلوں کی طرح آگ بجھانے میں مصروف تھے۔ ان لوگوں کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔

معلوم ہوا کہ چند لوگ جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں، آگ میں گھر چکے ہیں۔ شاید وہ سب اتنی گہری نیند سو رہے تھے کہ انہیں اس حادثہ کا علم ہی نہیں ہوا۔ اور اب جب کہ وہ بیدار ہوئے تھے تو آگ کا سمندر ان کے لئے موت بن چکا تھا۔ سیڑھیاں، برآمدے اور راہداریاں سب کی سب لپیٹ میں تھیں۔

موت کا اس سے زیادہ بھیانک رقص میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔

آگ اب کیبنوں کو جلا کر تیزی سے جہاز کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ لکڑی کے تختے اور دوسرے سامان آگ کے اندر تنکوں کی طرح جل رہے تھے۔ چند ہوشیار لوگوں نے بالٹیوں اور کنستروں میں رسے باندھ باندھ کر سمندر کے پانی سے فرش کو تر کرنا شروع کر دیا تھا کیونکہ اب جہاز کا فرش گرم ہونے لگا تھا اور شاید ان کا خیال تھا کہ اس طرح آگ ان تک نہیں پہنچ سکے گی۔

جوں جوں آگ بڑھتی جارہی تھی لوگ آخری عرشہ کے کونے میں سمٹتے جارہے تھے۔ اجنبیت کا احساس ختم ہو چکا تھا۔ موت کا فرشتہ آگ کی صورت میں ان بے بس انسانوں کو نگلنے کے لئے بیتاب ہو رہا تھا۔ اور ہر شخص موت سے بچنے کی خاطر آگ سے دور رہنے کی کوشش میں ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے عرشہ کے آخری کونے میں پہنچنا چاہتا تھا۔ جہاز کی سیر کے دوران میں نے ایک جگہ سرخ رنگ سے یہ لکھا ہوا دیکھا تھا۔

"اگر سمندر میں جہاز کو آگ لگ جائے تو یہ حادثہ خطرناک ہوسکتا ہے۔"

اس جملہ کو پڑھ کر اس وقت میں نے اسے نہایت احمقانہ وارننگ قرار دیا تھا۔لیکن اب جب کہ یہ حادثہ پیش آچکا تھا تو مجھے اس کے سنگین ہونے کا احساس ہوا۔ میں سمجھتا تھا اگر جہاز میں آگ لگ جائے تو اسے سمندر کے پانی سے بہ آسانی بجھایا جاسکتا ہے۔ مجھے اس بات کا علم ہی نہیں تھا کہ سمندری ہوائیں اس آگ کو اور زیادہ بھڑکا دیتی ہیں۔

یہ کتنا دلخراش منظر تھا کہ سینکڑوں انسان سطح آب پر گھرے ہوئے تھے۔ آگ جس کا دشمن پانی ہے وہی اپنے دشمن کے سینے پر موت کا ہولناک رقص کر رہی تھی۔انسان جو کہ آگ اور پانی کو اپنا مطیع سمجھتا ہے ان کے سامنے اس وقت بالکل بے بس تھا۔

سینکڑوں انسان اس وقت موت سے بچنے کی خاطر اور جہاز کے انتہائی چھوٹے سے عرشے پر زندہ رہنے کی خاطر کوشش کر رہے تھے۔ان سب کے چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی۔

میں نے ایک نوجوان عورت کو دیکھا جو اپنے بچے کو سینے سے چمٹائے ریلنگ سے لگی کھڑی تھی کہ اوپر سے اس پر دو تین آدمی آگرے۔فضا میں ایک چیخ بلند ہوئی ماں بچے کے ساتھ ہی سمندر میں جا گری۔

میں لوگوں کے درمیان اس طرح دبا کھڑا تھا کہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔اس کے باوجود میں نے مشکل سے گردن گھما کر سمندر کی طرف دیکھا۔وہ وشگی کی بیوی تھی۔وہ آخری وقت تک بچے کو سینے سے لگائے لہروں سے لڑتی اور مدد

کے لئے چلاتی رہی۔

اس وقت بے حسی کا یہ عالم تھا کہ کسی نے اس جانب توجہ ہی نہیں دی۔ موت سے بچنے کی کوشش میں انسان ایک دوسرے کو خود موت کے منہ میں دھکیل رہے تھے۔

"کتنا خودغرض ہے انسان!" میں نے سوچا اور ضمیر سے شرمندہ ہو کر میں نے ایک بار پھر گردن گھما کر سمندر کی طرف دیکھا۔وشگی کی بیوی کا دوپٹہ سطح سمندر پر تیر رہا تھا۔ جیسے وہ ہم سب کا منہ چڑا رہا ہو۔

آگ بجھانے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد عملے کے لوگ مسافروں کی طرف متوجہ ہوئے۔ جہاز کے عملے کے ہر فرد نے لائف جیکٹ پہن رکھی تھی۔

خلاصیوں نے تیزی کے ساتھ جہاز سے لٹکی ہوئی کشتیاں سمندر میں اتار دیں۔کشتیوں کے سمندر میں اترتے ہی مجمع میں ہل چل سی مچ گئی۔ ہر شخص کی کوشش یہی تھی کہ وہ پہلے کشتیوں میں سوار ہوجائے۔ ایک ایک خلاصی پہلے ہی کشتیوں میں پہنچ چکے تھے۔اس دھکم پیل میں جہاز کا کپتان چلایا:"سب سے پہلے عورتیں کشتیوں میں سوار ہوں گی۔ یہ سن کر عورتوں نے اسے گھیر لیا۔اب ہر عورت خوشامد کر رہی تھی کہ پہلے اسے کشتی میں سوار کردیا جائے۔ ان عورتوں کو اس وقت اپنے شوہروں سے زیادہ اپنی جانیں عزیز تھیں۔ کپتان نے سب کو دلاسا دیا اور کشتیوں تک پہنچنے کی خاطر ایک رسہ پکڑ کر نیچے اتر جانے کو کہا۔"

سب سے پہلے ایک انگریز عورت کو نیچے اتر جانے کو کہا گیا۔ پھر اس کی دیکھا دیکھی بہت سی عورتوں نے رسہ پکڑ کر ایک ایک کر کے نیچے اترنا شروع کر دیا۔

ایک عورت نے ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ کپتان نے حکم دیا کہ یہ اتار دو۔ ورنہ رسے سے الجھ پڑے گی اور تم نیچے گر جاؤ گی۔ اس عورت نے کچھ پس و پیش کیا میں نے دیکھا کہ اس کے شوہر نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کی ساڑھی اتار دی۔ شاید عام حالات میں اس کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی لیکن بیوی کی جان بچانے کی خاطر اسے یہ کرنا پڑا۔ وہ عورت صرف اسکرٹ اور بلاؤز پہنے ہوئے رسہ پکڑ کر نیچے اتر گئی۔

کشتی میں کھڑے ہوئے خلاصی عورتوں کو کمر سے پکڑ پکڑ کر قطار میں بٹھاتے جا رہے تھے۔ ان میں سے بہت سی عورتوں کیساتھ بچے بھی تھے۔ اور وہ اپنی ماؤں کے گلوں میں لٹک لٹک کر کشتیوں میں پہنچے تھے۔

تین کشتیاں عورتوں سے بھر گئیں۔ اور ان میں مزید گنجائش نہ رہی تو خلاصیوں نے نیچے سے رسے کاٹ دیئے اور کشتیاں سمندر کی لہروں پر تیرنے لگیں۔

اس کے بعد جتنی بھی کشتیاں تھیں ان سب میں اسی طرح رسہ پکڑ پکڑ کر مرد سوار ہو گئے۔ بعض دفعہ سمندر کی اونچی لہر آتی تو لوگ چیخنے لگتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کشتی الٹ رہی ہے لیکن پھر بال بال بچ جاتی۔

اچانک ایک لرزہ خیز دھماکے کے ساتھ دوسرے عرشے کا جلتا ہوا حصہ سمندر میں گر گیا۔ آگ کے سرخ شعلے ایک دم نیلے ہو گئے۔ اور ان میں ایسی چمک پیدا ہوئی جیسی آسمانی بجلی گرنے سے ہوتی ہے۔

ایک لمحے کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اندھا ہو گیا ہوں۔ آنکھیں کھلی تھیں مگر نظر کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بے پناہ چیخوں کا ایک شور مجھے سنائی دیا۔ اس شور میں کوئی شخص حلق پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ ''جہاز کی ٹینکی پھٹ چکی ہے۔ پانی بھر رہا ہے۔ فوراً

سمندر میں کود جاؤ۔''

میں جس جگہ کھڑا تھا اس کا فرش لرز رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد میری بینائی بحال ہوئی تو میں نے دیکھا کہ جہاز کے عملے اور مسافروں میں سے بچے کھچے لوگ دھڑا دھڑ سمندر میں کود رہے تھے۔ یکا یک مجھے خیال آیا کہ میں تیرنا تو جانتا ہی نہیں ہوں۔ میں سمندر میں کس طرح کود جاؤں۔ میں نے حسرت سے سمندر کی طرف دیکھا۔

کتنے خوش قسمت تھے وہ لوگ جو کشتیوں میں جانوروں کی طرح بھرے ہوئے سمندر کی لہروں پر زندہ تھے۔ پھر میری نظر ان لوگوں کی طرف گئی جو لائف جیکٹ پہنے اطمینان سے تیر رہے تھے۔ ابھی میں ان لوگوں کو دیکھ ہی رہا تھا کہ جہاز ایک جانب کو جھکنا شروع ہوا۔ اگر میں کٹہرے کو نہ پکڑ لیتا تو یقیناً سمندر میں جا گرتا۔

جہاز کا توازن بگڑ چکا تھا۔ اور وہ ہر ساعت ایک طرف کو جھکتا چلا جا رہا تھا۔

آگ کا اور میرا فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ موت میرے قریب آتی جا رہی تھی۔ میرے سامنے لپکتی ہوئی آگ کے شعلے تھے اور دوسری جانب سمندر کا ہرا پانی۔ میں موت کو اتنا قریب دیکھ کر حواس باختہ ہو چکا تھا۔ خود کو بچانے کی کوئی ترکیب میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ لیکن پھر بھی زندہ رہنے کی خاطر لوہے کے کٹہرے کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔

اچانک میں نے دیکھا کہ کوئی شخص سطح آب پر بیٹھا ہوا تیزی سے جہاز کے قریب آ رہا ہے۔ ''یہ کون ہو سکتا ہے'' میں نے سوچا۔ اس جلتے ہوئے جہاز کے قریب آنا خود کو موت کی دعوت دینا تھی لیکن وہ شخص جہاز کے قریب آتا جا رہا تھا۔ اور جب

وہ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر رہ گیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ میرے بحری سفر کا چینی دوست یوسف تشیک تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی لائف بوٹ میں بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے جنہیں میں نہیں پہچان سکا۔ یوسف تشیک کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا چپو بھی تھا۔

جہاز میں آگ لگنے سے لے کر اب تک مجھے اپنے اس ہم سفر کا خیال تک نہیں آیا۔ لیکن اس جاں کنی کے عالم میں اس نے مجھے یاد رکھا۔ یوسف تشیک پر نظر پڑتے ہی میں نے اسے نام لے کر پکارا۔

یوسف تشیک جو متلاشی نظروں سے ڈوبتے جہاز کو دیکھ رہا تھا، ایک دم میری طرف متوجہ ہو گیا۔ اور چلا کر بولا۔ ''نوجوان! فوراً ہی سمندر میں کود جاؤ۔''

اس کا حکم سنتے ہی میں کٹہرے پر چڑھ گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی میں تیرنا نہیں جانتا تھا۔

''نوجوان! جلدی کرو۔ ورنہ جہاز کے ساتھ ہی تم بھی ختم ہو جاؤ گے۔
''یوسف تشیک حلق پھاڑ کر چیخا۔ ''اللہ کا نام لے کر چھلانگ لگا دو۔''

''اللہ۔'' یہ نام سنتے ہی میرے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی دل سے خوف نکل گیا۔ میں نے ''اللہ مدد'' کہا اور کٹہرے سے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔

چھلانگ لگاتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے کسی نے پکڑ لیا ہو۔ اور پھر میں یوسف تشیک کی لائف بوٹ میں تھا۔

کیا میری چھلانگ اتنی درست تھی کہ میں سیدھا بوٹ میں پہنچ گیا۔ میں نے ایک نظر جہاز کی طرف دیکھا کہ کیسے میں نے چھلانگ لگائی تھی۔ اس کا فاصلہ سات

آٹھ فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ گویا اس وقت میرا اتھلیٹک ہونا کام آ گیا مجھے اپنی اس چھلانگ پر فخر تھا۔ پھر بھی میں نے احسان مندانہ نظروں سے یوسف تشیک کی طرف دیکھا۔ وہ سب سے بے خبر چپو چلانے میں مصروف تھا۔ وہ اس جلتے اور ڈوبتے ہوئے جہاز سے جلد از جلد دور ہو جانا چاہتا تھا۔

انسان کی زندگی میں بعض حادثے اور مصیبتیں ایسی آتی ہیں جب اسے اپنی موت کا یقین ہو جاتا ہے لیکن حالات اسے پھر زندہ رہنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ہم میں سے کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ منزل پر پہنچنے سے قبل ہولناک حادثے سے دوچار ہوں گے۔ ہمارا جہاز جل کر سمندر کی تہہ میں بیٹھ چکا تھا۔

اب ہم چار آدمی ___ میں، راجیشی، اس کا شوہر رمنا اور یوسف تشیک اس چھوٹی سی لائف بوٹ میں دبکے بیٹھے تھے۔ یہ لائف بوٹ اتنی چھوٹی تھی کہ اس میں صرف دو آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ چیف پیٹی آفیسر رمنا نے اسے غیر متوقع حادثہ پیش آنے کی صورت میں اپنے اور راجیشی کیلئے چھپا رکھا تھا لیکن یہ اس کی انسانیت تھی کہ اس نے مجھے اور یوسف تشیک کو بھی سوار کر لیا تھا۔ اور ہم سب ایک دوسرے کی ٹانگوں میں ٹانگیں پھنسائے بیٹھے تھے۔ دور دور تک سمندر کی دیو پیکر موجیں آپس میں ٹکراتیں تو ان کے شور سے کانوں کے پردے بیٹھتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

جب تیز ہوا چلتی اور بوٹ کی رفتار بڑھ جاتی تو مجھے یقین ہو جاتا کہ ہم جلد از جلد کنارے پر پہنچ جائیں گے یا پھر جلد از جلد ہمیں کوئی نہ کوئی جہاز مل جائے گا۔ اس خیال نے میرے دل سے آئندہ پیش آنے والے حالات کا تصور ختم کر دیا۔ میں پرسکون تھا، بہت ہی پرسکون۔ بالکل اپنے چینی دوست یوسف تشیک کی طرح لیکن

راجیشی اور اس کے شوہر کے چہرے پر کسی حد تک گھبراہٹ طاری تھی۔ رات کی سیاہی میں بھی ان کے چہروں پر خوف نمایاں نظر آتا تھا۔

میں نے سوچا کہ یہ دونوں میاں بیوی تو کئی برس سے سمندری سفر کر رہے ہیں، پھر خوف زدہ کیوں ہیں۔ شاید حادثہ سے وہ دونوں ہی بہت زیادہ خوف زدہ ہو گئے تھے۔

مشرق کی جانب آہستہ آہستہ صبح کاذب کا دھندلکا صبح صادق کی سپیدی میں تبدیل ہو رہا تھا۔ پھر جب صبح کی روشنی پھیلی تو میں نے دیکھا ہم لوگ اس بدنصیب جہاز سے بہت دور نکل آئے تھے۔

سمندر میں تاحدِ نگاہ اونچی اونچی لہروں کے سوا کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا۔

ہمارے مسافر ساتھی جو کشتیوں میں سوار تھے ان کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ میں نے گھبرا کر یوسف تشیک اور رمنا کی طرف دیکھا۔

''گھبراؤ نہیں۔'' یوسف تشیک نہایت ہی سمجھانے والے لہجے میں بولا۔ ''اب ہم تقدیر کے رحم و کرم پر ہیں جس اللہ نے ہمیں آگ سے بچایا ہے وہی ہمیں منزل تک بھی پہنچائے گا۔''

''لیکن دوسرے لوگ کہاں ہیں؟'' میں نے پریشانی سے پوچھا۔

''ہم سب بچھڑ چکے ہیں۔'' رمنا نے جواب دیا ''اب ہم لہروں کے رحم و کرم پر ہیں۔ ہواؤں کا رخ جدھر ہوگا، یہ لہریں ہمیں اسی طرف لے جائیں گی۔''

''کیا ہماری مدد کو کوئی نہیں آئے گا؟'' میں نے بڑی ہی امید سے پوچھا۔

''جب آگ قابو سے باہر ہو چکی تھی تو کپتان بار بار sos کا پیغام نشر کر رہا

تھا۔'' رمنا نے بتایا۔ ''جس کا مطلب سمندر میں موجود کسی بھی جہاز سے مدد حاصل کرنا ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات سب کو معلوم ہے کہ کوئی بھی ہماری مدد کو نہیں آیا۔''

''ممکن ہے اس وقت سمندر میں آس پاس کوئی جہاز موجود ہی نہ ہو۔'' یوسف تشیک نے جواب دیا۔

''ہاں، اس کے علاوہ اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔'' رمنا نے گہرا سانس لے کر جواب دیا۔ پھر اس نے لائف بوٹ کے ایک کونے میں نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''دوستو! ہماری زندگی کا نہایت ہی المناک اور خطرناک سفر شروع ہو چکا ہے۔ انسان اگر خشکی پر کسی حادثے کا شکار ہو جائے تو منزل پانے تک کسی نہ کسی طرح سے زندہ رہ لیتا ہے لیکن سمندر میں زیادہ عرصہ زندہ رہنا بہت مشکل کام ہے۔ ''پھر اس نے کونے میں پڑے ہوئے تین چار ٹین کے ڈبوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جہاز سے جس بدحواسی میں ہم بھاگے'' ہم اس میں صرف دودھ کے یہ ڈبے ہی ساتھ لا سکے ہیں۔ اور اگر ہوائیں ہمارے موافق رہیں تو ہم دو دن میں شمال کی جانب خشکی پر پہنچ جائیں گے۔ اور اس وقت تک دودھ کے یہ ڈبے ہماری غذائی ضروریات کے لئے کافی ہوں گے۔

اس کی یہ بات سن کر ہم سب کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

سورج جب سر پر آیا تو گرمی سے میرا جسم جھلسنے لگا۔ میں نے یوسف تشیک کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی قمیض اتارے بیٹھا تھا۔ اور رمنا پوری قوت سے چپو چلا رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ کشتی کا رخ شمال کی جانب رہے۔ میں نے بھی اپنی قمیض اتار دی۔ راجیشی نیلگوں آسمان پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد رمنا نے

مجھے چپو سنبھالنے کا اشارہ کیا۔ اور خود دودھ کا ڈبہ کھول کر منہ سے لگا لیا۔ وہ پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ راجیشی نے اس کی قمیض سے اس کا پسینہ پونچھا۔

زندگی میں کبھی میں نے کشتی رانی نہیں کی تھی۔ لیکن اب حالات نے مجھے چپو چلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ یقین جانئے پانی میں چپو چلانا بڑا ہی جان جوکھوں کا کام ہے۔ پانی جو بظاہر، ہلکا نظر آتا ہے، جب راستہ بنانے کی خاطر کاٹا جاتا ہے تو یہ بہت زیادہ وزنی ہو جاتا ہے۔ اور پوری جسمانی طاقت صرف کرنا پڑتی ہے۔ میں پندرہ بیس منٹ ہی میں ہانپ گیا۔ اور پیاس کی شدت سے گلا خشک ہونے لگا۔ میں نے غیر دانستہ طور سے سمندر میں ہاتھ ڈالا۔ اور چلو میں پانی لے کر پینے ہی کو تھا کہ رمنا نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور نہایت سخت لہجے میں بولا۔ ''خبردار! یہ پینے کا پانی نہیں ہے۔'' پھر وہ سمندر پر نظریں جما کر بولا۔ ''ہم جس جگہ موجود ہیں، یہاں کا پانی زہریلا ہے۔''

''مجھے بہت پیاس لگ رہی ہے۔'' میں نے بے تابی سے کہا۔

''کچھ دیر صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی وسیلہ بنا دے گا۔'' یوسف تشیک نے مجھے تسلی دی۔ ''شاید قدرت ہمارا امتحان لے رہی ہے۔ ہمیں اس آزمائش پر پورا اترنا چاہیئے۔''

اس کی یہ بات سن کر میں چڑ سا گیا اور بولا۔ یہ کون سی آزمائش ہے اور امتحان لینے کا کون سا موقع ہے!

''اللہ اپنے بندوں کا امتحان جب چاہے اور جہاں چاہے لے سکتا ہے۔'' اس نے اسی تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اللہ مصیبت کے وقت اپنے بندوں کی مدد کرنے کی بجائے ان کی آزمائش شروع کر دیتا ہے۔'' میں نے جھنجھلا کر کہا۔

''ہاں، تاکہ وہ اپنے بندوں کے صبر اور توکل کو آزما سکے۔'' یوسف تشیک نے مسکرا کر جواب دیا۔ ہم پہ ابھی مصیبت آئی کہاں ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔!'' میں نے قدرے حیرت سے کہا۔ ''بھلا اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہو گی کہ اچھے خاصے جہاز کو آگ لگ گئی اور اب ہم اس چھوٹی سی کشتی میں لہروں کے رحم و کرم پر ہیں۔''

''تم اسے مصیبت کہتے ہو!'' اس نے جیسے بات کی تردید کر دی۔ پھر مسکرا کر بولا۔ ''ہمیں اس ذات کا شکر ادا کرنا چاہیئے جس نے ہمیں جہنم کی آگ سے بچا کر سطح آب پر زندہ رکھا ہے۔''

''نہیں، میں نہیں مانتا۔'' میں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی رمنا نے ایک جھٹکے کے ساتھ مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ پھر ہم سب کو کشتی کے اندر چھپ جانے کو کہا۔ کیونکہ چھوٹی بڑی کئی مچھلیاں کشتی کے چاروں طرف اپنے غار جیسے منہ کھولے تیر رہی تھیں۔

رمنا نے بتایا کہ وہ شارک مچھلیاں تھیں جو خون کی بُو جلدی سے سونگھ لیتی ہیں۔ لیکن شاید قدرت ہمیں زندہ رکھنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

اللہ پر بھروسہ

میرا مادہ پرست ذہن پوری طرح بیدار تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ چھوٹی سی کشتی ہمیں جلد از جلد خشکی پر پہنچا دے گی لیکن ایسا ہونا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ چپو چلاتے چلاتے ہم نڈھال ہو چکے تھے۔ رہی سہی کسر سمندر کا موسم پوری کر رہا تھا۔

دُور سمندر میں سورج نے ڈبکی لگائی اور اپنے پیچھے سُرخ رنگ بکھیرتا چلا گیا۔ پھر وہ سرخی بھی غائب ہو گئی اور آسمان پر سیاہ بادل اُمنڈ اُمنڈ کر آنے لگے۔ جلد ہی چاروں جانب گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اور رات کی سیاہی نے اندھیرے کو اور زیادہ گہرا کر دیا۔

کبھی کبھی بجلی چمکتی تو اس اندھیرے میں سمندر کی موجیں اٹھتی نظر آتیں۔ ہم چاروں ایک دوسرے سے چمٹے بیٹھے تھے۔ راجیشی ہمارے درمیان میں تھی۔ رات کے آخری حصے میں موسلا دھار بارش ہونے لگی جس سے ہم سب کے کپڑے تر ہو گئے۔ اور تھوڑی دیر بعد ہی سردی سے کپکپانے لگے۔ سردی سے بچنے کے لئے ہمارے پاس کوئی انتظام نہیں تھا۔ رمنا اور راجیشی ایک دوسرے سے اس طرح چمٹے ہوئے تھے جیسے وہ ایک ہی ہوں۔

خدا خدا کر کے بارش تھمی اور بادل چھٹے۔ پھر نیلے آسمان پر ستارے چمکتے

ہوئے نظر آئے جیسے وہ ہماری بے بسی پر مسکرا رہے ہوں۔

پھر کچھ دیر بعد افق سے سورج ابھرا اور دن نکل آیا۔ میں اپنے چہرے کی کیفیت خود بتانے سے قاصر ہوں۔ البتہ اس چوبیس گھنٹے کے دوران دوسروں کے چہروں پر مردنی سی چھا چکی تھی۔ صرف چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

ہمارے پاس دودھ کے ڈبے ختم ہو چکے تھے۔ رمنا نے شمال کی طرف جس خشکی کی امید ظاہر کی تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔ کیوں کہ ہوائیں ہمارے مخالف چل رہی تھیں۔

ہمارا یہ جان لیوا سفر جاری تھا۔ سورج سارا دن پوری آب و تاب سے ہمارے سروں پر چمکتا رہتا تھا۔ جس سے بدن جھلس جاتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ہمارے جسموں میں سوئیاں چبھی جا رہی ہیں۔

سہ پہر کے بعد یہ عذاب دور ہوتا تو ایک دوسری مصیبت شروع ہو جاتی۔ سمندر کی یخ بستہ ہوائیں ہمارے جسموں میں گھسنا شروع کر دیتیں۔ ان سے بچنے کی خاطر ہم کشتی میں لیٹ جاتے تو موجوں کا جھاگ مسلسل ہم پر بارش کی طرح برستا رہتا۔

چار روز...... جی ہاں، چار روز اسی طرح گزر گئے بھوک اور پیاس نے ہمیں بالکل ہی نڈھال کر دیا...... راجیشی اور رمنا زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سفر کبھی ختم نہ ہوگا۔ ہم کبھی خشکی پر نہیں پہنچ سکیں گے۔

راجیشی کو یقین تھا کہ قادوسوں نے جو پیش گوئیاں کی تھیں وہ حرف بحرف

سچ ثابت ہوتی جارہی ہیں۔ اور ہم سب زندگی کے بجائے موت کی طرف جارہے ہیں۔ اس کی یہ باتیں سُن سُن کر کبھی کبھی تو میں بھی مایوس ہوجایا کرتا تھا۔

پیاس کی شدت سے میری زبان پر کانٹے سے پڑ گئے تھے اور جب میں تکلیف سے منہ کھولتا تو تالو چٹخنے لگتا۔ یہی حال دوسروں کا بھی تھا۔ لیکن یوسف تشیک ہم سب کے برخلاف بڑا ہی حوصلہ مند تھا۔ اسے اپنے اللہ سے بڑی ہی توقعات تھیں۔ بعض دفعہ وہ کوئی آیت زور زور سے پڑھنے لگتا۔ مجھے اس کی یہ آواز بڑی ہی ناگوار گزرتی۔

حالات ابتر سے ابتر ہوتے جارہے تھے اور وہ بے وقوف اب تک اَن دیکھے خدا سے زندہ رہنے اور خشکی پر پہنچنے کی امید رکھتا تھا۔ بھلا سوچئے تو مادی وسائل کے بغیر ہم کسی طرح زندہ رہ سکتے تھے۔ اور کس طرح خشکی پر پہنچ سکتے تھے۔

پانچویں دن آسمان پر سیاہ بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دکھائی دیئے جن کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھتی جارہی تھی۔ ہم نہایت بے صبری سے منہ کھولے ان کے برسنے کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن افسوس یہ بادل پانی کا ایک قطرہ برسائے بغیر ہمارے سروں پر سے گزر گئے۔

اب یہ تکلیف دہ سفر ناقابلِ برداشت ہوتا جارہا تھا۔ بھوک اور پیاس نے دماغوں کو متاثر کرنا شروع کردیا تھا۔ رمنا کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔ ایک بار تو اس نے اپنی بیوی سے دیوانگی کی حالت میں یہ تک کہہ دیا کہ اس کے جسم کی گرمی ختم ہوچکی ہے، وہ اسے اپنی گود میں دبالے اور اس بے چاری نے فوراً ہی اپنی قمیص

اٹھا کر اسے سینے سے چمٹا لیا تھا۔

میری بھی ذہنی حالت بدلتی جارہی تھی۔ مجھے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا کہ سمندر میں کوئی جہاز جارہا ہے پھر دور کہیں خشکی نظر آنے لگتی۔ جب بھی ایسا ہوتا تو میں اپنی جگہ بے چین ہوجاتا۔

مجھے بے چین دیکھ کر یوسف تشیک تسلی دیتا۔ اس کا ایک ہی کہنا تھا کہ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ ہم ایک نہ ایک دن ضرور خشکی پر پہنچیں گے۔ اس کی یہ بات سن کر میں پھر پرسکون ہوجاتا۔

گو کہ یوسف تشیک بھی جسمانی لحاظ سے کمزور تھا لیکن اس کا دل ودماغ بالکل صحیح حالت میں تھا حقیقتاً وہی ہم تینوں کو سنبھالے ہوئے تھا۔

اسی طرح دس دن گزر گئے۔

بغیر کھائے پیئے ہمارا یہ سفر جاری تھا۔ ہم چاروں بے جان لاشوں کی طرح چھوٹی سی کشتی میں پڑے آسمان کو تک رہے تھے۔ ہم کو امید تھی کہ شاید بادل ہمارا حلق تر کرجائیں۔ بعض دفعہ مجھے یوں محسوس ہوتا کہ زبان تڑخ رہی ہے۔ سورج جب سر پر آتا تو یہ تکلیف اور بڑھ جاتی۔ رمنا کی حالت سب سے زیادہ خراب ہوتی جارہی تھی۔ اس نے بولنا بند کردیا تھا۔ بس وہ غشی کی حالت میں اوندھے منہ پڑا رہتا تھا۔ اس کی بیوی راجیشی کا بدن بھی کمزور پڑنے لگا تھا۔ اس کی بیوی نے سمندر کا پانی اس کے منہ میں ڈالنا چاہا لیکن وہ نہیں پی سکا۔ اور ہونٹوں کے کناروں سے بہہ نکلا۔

"خدا پیاس کی تکلیف سے دشمن کو بھی موت نہ دے۔ اور یہ عذاب کی

آخری شکل ہے۔''

''ہم بھگوان سے بارش کی دعا کریں۔'' راجیشی نے اداس لہجے میں کہا۔

خدا کا نام سنتے ہی یوسف تشیک کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میرے دماغ کے ایک گوشے میں آواز آئی کہ اب یوسف تشیک کے ان دیکھے خدا سے مدد مانگی جائے۔ لیکن نہ جانے کیوں اس خواہش کا سوچتے ہوئے مجھے شرم سی آرہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں خدا کو نہیں مانتا تھا۔

اس ہولناک حالت اور بے بسی کے وقت جب کہ سورج جسموں کو جھلس رہا تھا، سمندر کی بپھری ہوئی موجیں نامعلوم منزل کی طرف لے جارہی تھیں، یوسف تشیک نے اپنا سر کشتی کے تختے سے ٹکا دیا۔ راجیشی نے بھی اس کی تقلید کی اور میں سوچنے لگا '' کتنے بے وقوف ہیں یہ ایک انجانی ہستی سے پانی برسانے کی توقع کررہے ہیں۔ ارے جب سمندر کا پانی بھاپ بن کر اڑے گا، بادل بنیں گے، خود ہی بارش ہوگی۔ سائنس کا یہ اصول ذہن میں آتا ہے۔

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مغرب کی جانب سے سیاہ گھٹا اٹھی جس نے چشم زدن میں آسمان کو ڈھانپ لیا۔ اور پھر گرج چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہوگئی بارش کا ہر قطرہ ہمارے جسموں میں زندگی کی لہر دوڑانے لگا۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر پیالہ سا بنایا۔ اور جب وہ پانی سے بھر گیا تو اپنے خشک ہونٹوں سے لگا لیا یہی حرکت راجیشی اور یوسف تشیک بھی کررہے تھے۔ رمنا نے لیٹے لیٹے منہ کھول لیا تھا۔ اور بارش کی دھاریں سیدھی اس کے منہ میں جارہی تھیں لیکن یہ اس کی پیاس بجھانے کے لئے ناکافی تھیں۔ جلد ہی

ہمارے کپڑے پانی سے تر ہو گئے۔ پانی نے اس وقت آبِ حیات کا کام کیا۔ ہمارے جسموں میں ایک بار پھر توانائی دوڑنے لگی۔ لیکن رمنا اسی طرح بے سُدھ پڑا تھا۔ راجیشی نے اسے دیکھا تو فوراً قمیض اتار لی۔ اس کا جسم دیکھ کر مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ اور یوسف تشیک اسے برہنہ دیکھ کر فوراً ہی اوندھے منہ کشتی میں لیٹ گیا۔

راجیشی نے اپنی بھیگی ہوئی قمیض کا تمام پانی رمنا کے منہ میں نچوڑ دیا۔ پانی حلق سے اترتے ہی اس نے آنکھیں کھول دیں۔ راجیشی کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اور وہ بار بار قمیض پانی سے تر کر کے اس کے منہ میں نچوڑتی جا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ کشتی کی رفتار تیز ہوتی جارہی ہے۔ میں اپنے شک کو دور کرنے کی خاطر کچھ دیر اندازہ لگاتا رہا۔ کشتی کی رفتار واقعی تیز ہوتی جارہی تھی۔ یوسف تشیک بھی جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے بھی کشتی کی رفتار کا اندازہ ہو چلا تھا۔ ہمارے چہروں پر خوشیاں پھیل گئیں۔ کیونکہ ہمارے سامنے سمندر کے بیچ میں ایک پہاڑی تھی اور ہماری کشتی خود بخود تیزی سے اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔

لیکن......لیکن، یوسف تشیک کو ایک نئے خطرے کا احساس ہوا۔

اس نے مجھ سے کہا۔'' اگر کشتی اسی رفتار سے چلتی ہوئی پہاڑی سے ٹکرائی تو ہم میں سے کوئی زندہ نہ بچ سکے گا۔''

یہ کہہ کر اس نے چپو سنبھالا اور کشتی کا رخ بدلنے لگا لیکن کشتی کا رُخ بدلنے کی بجائے اس کی رفتار کچھ کم ہوگئی۔ لیکن یہ رفتار بھی حادثہ کا سبب بن سکتی تھی۔

جوں جوں ہم لوگ پہاڑی کے قریب آتے جا رہے تھے خود کو حادثہ سے بچانے کی ترکیبیں بھی سوچتے جا رہے تھے۔ راجیشی، یوسف تشیک اور میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ پہاڑی کے قریب پہنچتے ہی کشتی سے چھلانگ لگا دیں گے اور پھر رمنا کو بھی بچانے کی کوشش کریں گے۔ وہ ابھی بھی غشی کی حالت میں لیٹا ہوا تھا۔

لیکن پہاڑی کے قریب پہنچ کر کشتی خود بخود ایک سرنگ میں داخل ہوگئی۔

درحقیقت پانی کی وہ دھار جس پر ہماری کشتی تیزی سے بہتی چلی آ رہی تھی، اس پہاڑی میں واقع ایک سرنگ میں جا رہی تھی۔

اور اب ہم لوگ ایک سرنگ میں سفر کر رہے تھے۔ سرنگ میں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ سرنگ کی چوڑائی دیکھنے کی خاطر یوسف تشیک نے چپو ہاتھ میں لے کر دائیں بائیں پھیرایا کہ شاید دیوار سے ٹکرا جائے لیکن معلوم ہوتا تھا کہ سرنگ بہت ہی زیادہ چوڑی تھی۔

اس نئی مصیبت سے ہم سب بہت ہی زیادہ پریشان ہو گئے۔ راجیشی کا خیال تھا کہ کہیں یہ سرنگ سمندر کی تہہ میں نہ جا رہی ہو۔ اگر ایسا ہوا تو پھر زندگی کی کوئی امید نہیں۔ مگر یوسف تشیک کا کہنا تھا کہ اللہ جو بھی کرتا ہے، بہتر کرتا ہے۔

یہ سرنگ کیا تھی قبر کی طرح تاریک راستہ تھا۔ نجانے کب تک ہم سب اس سرنگ میں سفر کرتے رہے۔ کافی دیر بعد ہمیں گرمی کا احساس ہوا اور پھر ہم جوں جوں آگے بڑھتے جا رہے تھے گرمی بھی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ جلد ہی ہمارے جسموں سے پسینہ بہنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہم جہنم کی طرف سفر کر رہے ہیں۔

پھر جب گرمی بالکل ہی ناقابلِ برداشت ہوگئی تو ہم نے اپنے کپڑے اتار

دیئے۔ اور پھر کچھ فاصلہ پر ہم نے اوپر سے آگ کی ایک موٹی سی دھار پانی میں گرتی دیکھی۔ سرنگ کی چھت سے آگ کا مینہ برس رہا تھا جس جگہ پانی میں آگ گر رہی تھی وہاں دھواں ہی دھواں تھا۔

موت ایک بار پھر ہمارے سامنے سر اُٹھائے کھڑی تھی۔

آگ کی تپش سے ہمارے جسم جھلسنے لگے۔ یوسف تشیک نے نہایت عقلمندی سے کام لیا۔ چپو کو مضبوطی سے ہاتھوں میں پکڑ کر کھڑا کیا جس سے چپو کا سرا سرنگ کی چھت سے جا لگا۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ کشتی کو اس جگہ سے جہاں آگ گر رہی تھی دھکیلنا شروع کر دیا۔ لیکن اس جگہ گرمی اتنی زیادہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا ہم سب جل کر خاکستر ہو جائیں گے۔

یوسف تشیک مسلسل اپنی کوشش میں لگا ہوا تھا بالآخر ہم آگ کی اس بارش سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے ہم تینوں پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کشتی میں سوار تھے اور کشتی چلی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم کو روشنی دکھائی دی کشتی سرنگ سے نکل آئی تھی۔ اب ہم کھلے آسمان کے نیچے تھے۔ یہ کوئی آتش فشاں تھا جس کی تہ میں ہم نے اپنی گزرگاہ بنائی تھی۔

ہماری کشتی خود ہی ٹھہر گئی۔ ہم سب گھبرا گئے تو دیکھا کہ سامنے ہی نہایت سرسبز و شاداب خطہ ہے تھوڑے ہی فاصلہ پر وہ پہاڑی ہے جس کی سرنگ سے ہم نکل کر آئے تھے۔

اور اس پہاڑی پر نہایت ہی پرانی طرز کا محل بنا ہوا تھا۔

میں نے اور یوسف تشیک نے کشتی سے چھلانگ لگا دی۔ پھر ہم دونوں

نے کشتی کو گھسیٹ کر ساحل سے قریب کر دیا۔ راجیشی کمزور ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود وہ خود ہی نیچے اتری۔ رمنا غشی کی حالت میں کشتی کے اندر ہی موجود رہا۔

ساحل کی نرم اور چاندی جیسی سفید ریت پر بیٹھ کر ہم حسرت بھری نظروں سے جزیرہ کو دیکھ رہے تھے۔ پچیس دن کے بعد ہم نے خشکی پر قدم رکھا تھا۔

اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اس نے ہمیں ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا ہے۔" یوسف تشیک نے نہایت ہی تشکر لہجہ میں کہا۔ "اس جزیرہ پر یقیناً ہم زندگی گزار سکیں گے۔" "ہمیں سب سے پہلے پانی تلاش کرنا چاہیئے۔" راجیشی نے نہایت ہی مُردہ آواز میں کہا۔

یوسف تشیک نے جواب دینے کے بجائے محل نما عمارت کی طرف دیکھا۔ میری اور راجیشی کی نگاہیں خود بخود ادھر اٹھ گئیں۔

پہاڑی پر بنی ہوئی یہ عمارت دُھند اور کُہر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ عمارت کے چاروں کونوں پر اونچے اونچے مینار نما برج بنے ہوئے تھے جن کے کلس سورج کی روشنی میں جھلملا رہے تھے۔

پرشکوہ اور شاندار عمارت چٹان کی ڈھلوان پر بنی ہوئی تھی۔ اور اس کے تین اطراف میں سمندر تھا۔

میں نے اور یوسف تشیک نے اس عمارت تک پہنچنے کا ارادہ کیا۔ راجیشی کو ہم نے کشتی کے پاس ہی انتظار کرنے دیا۔ راجیشی ویسے بھی اپنے شوہر رمنا کو چھوڑنے پر تیار نہ تھی۔

پہاڑی جس پر پرانی طرز کا محل بنا ہوا تھا، سو فٹ سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

ہمارا خیال تھا کہ ہم ایک ایسے جزیرے پر پہنچ چکے ہیں جہاں آبادی ہے اور یہ محل نما عمارت اس جزیرہ کے حاکم کا مسکن ہے۔ جب ہم دونوں گرتے پڑتے اوپر پہنچے تو دیکھا کہ اس محل نما عمارت کا صدر دروازہ نہایت ہی مضبوط لکڑی کا بنوا ہوا تھا۔ اس میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اور باہر کی جانب ایک زنگ آلودسی زنجیر لٹک رہی تھی۔ اس کا ایک سرا اس عمارت کی دیوار کے پیچھے چلا گیا تھا۔

قدرے توقف کے بعد یوسف تشیک مجھ سے بولا۔ "معلوم ہوتا ہے، ہم اس جزیرہ کے حاکم کے دروازے پر آ گئے ہیں۔"

"بہر حال، زنجیر ہلانا چاہیئے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں اس وقت مدد چاہیئے۔"

میری بات سنتے ہی یوسف تشیک نے زنجیر کو کھینچا۔ زنجیر کے کھینچتے ہی دُور گھنٹہ بجنے کی آواز آئی۔

ہم دونوں خاموشی سے دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگے۔ ایک یا دو منٹ گزرے ہوں گے کہ دروازے کو جنبش ہوئی۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ اپنی نگاہیں دروازے پر جما دیں۔ دروازہ کے دونوں پاٹ آہستہ آہستہ کھلتے چلے گئے دروازہ کے کھلتے ہی ہم دونوں دہشت زدہ سے ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔

ہمارے سامنے دونوں دروازوں کے درمیان نہایت ہی طویل القامت ایک عورت کھڑی تھی۔ اس کا قد کم از کم ۹ فٹ تھا۔ اور جسم گینڈے کی طرح موٹا اور مضبوط اس قد و قامت کی عورت ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے سیاہ گھنے

بال سامنے سینے پر پھیلے ہوئے تھے۔

ممکن تھا میں اسے دیکھ کر فرار ہو جاتا لیکن یوسف تشیک نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اس نے لمحہ بھر ہم لوگوں کو دیکھا۔ پھر ایک دلفریب مسکراہٹ سے بولی ''خوش آمدید اجنبیو! خوش آمدید۔ ڈاکٹر نستور اس جزیرہ پر آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔''

یوسف تشیک نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن اس عورت نے اپنا ہاتھ نہیں بڑھایا۔ یا ممکن ہے اسے یوسف تشیک کا ہاتھ نظر ہی نہ آیا ہو۔

''آپ لوگ یہاں کیسے پہنچ گئے؟'' اس نے سپاٹ لہجہ میں پوچھا۔

یوشف تشیک نے اُسے مختصر الفاظ میں تمام روئیداد سنادی۔

''بہت خوب! وہ نہایت ہی خوش اخلاقی سے بولی۔ ''اب آپ لوگ اس جزیرہ پر ایک نئی زندگی کا آغاز کیجئے گا۔ آیئے میرے ساتھ آیئے۔'' یہ کہہ کر وہ واپس جانے کو مڑی۔

''لیکن...... راجیشی......'' میں نے نہایت سرگوشی کے انداز میں یوسف تشیک سے کہا۔

''آپ کے دوسرے ساتھی بھی آجائیں گے۔'' اس نے پلٹ کر جواب دیا۔ اس جگہ آپ لوگوں کو کسی قسم کی کوئی بھی تکلیف نہیں ہوگی۔''

مجھے تعجب ہوا کہ فاصلہ پر ہونے کے باوجود اس لمبی عورت نے کس طرح میری بات سن لی۔ میں نے یوسف تشیک کی طرف دیکھا اور پھر اس عورت کے پیچھے ہم دونوں چل دیئے۔

ہم ایک بہت بڑے باغ سے گزر کر اور آخر میں سنگ مرمر کی سیڑھیاں چڑھ کر عمارت میں داخل ہو گئے۔ یہ عمارت لاتعداد کمروں، برآمدوں اور راہداریوں پر مشتمل تھی۔

مختلف راہداریوں سے گزرنے کے بعد اس عورت نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور بولی ''یہ آپ کی خوابگاہ ہے۔''

ہم دونوں خاموشی سے اندر داخل ہو گئے۔

ہمارے داخل ہوتے ہی کھٹ کی آواز آئی اور دروازہ بند ہو گیا۔ جیسے اسے تالا لگا دیا گیا ہو۔ میں نے اور یوسف تشیک نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ اور ابھی کچھ سمجھنے بھی نہ پائے تھے کہ سامنے دیوار میں بنا ہوا دروازہ کھلا اور ایک حبشی النسل لڑکی اندر داخل ہوئی۔

اس لڑکی کا رنگ کالا تھا مگر چہرہ کے نقش نہایت ہی دیدہ زیب تھے۔ اس نے سرخ رنگ کا نہایت ہی چُست لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کپڑوں کے دو تھیلے تھے۔

''لیجئے! لباس تبدیل کر لیجئے۔'' اس نے تھیلے ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر نستور طعام گاہ میں آپ کے منتظر ہیں۔''

ہم دونوں نے ایک ایک تھیلا لے لیا۔ یوسف تشیک بولا۔ ''ڈاکٹر سے تو ملاقات ہو چکی ہے۔''

''وہ...... ڈاکٹر نہیں۔'' لڑکی نے مختصر سا جواب دیا اور جس دروازہ سے آئی تھی اسی دروازہ سے واپس چلی گئی۔

ہم دونوں نے لفافوں کو کھولا۔ ان میں ہلکے رنگ کے پاجامے اور قمیضیں تھیں۔ ہم دونوں نے لباس بدلے اور طعام گاہ میں جانے کا انتظار کرنے لگے۔

☆☆☆

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم کسی بادشاہ کی طعام گاہ میں کھڑے ہیں۔ ایک ایک چیز سے شاہانہ جلال ٹپکتا تھا۔ کمرہ کی چھت شاہ بلوط کی بنی ہوئی تھی۔ اس پر کسی ماہر تراش نے نہایت ہی دلکش بیل بوٹے بنائے تھے۔ چھت پر کئی دیدہ زیب جھاڑ لٹک رہے تھے۔ اور ساگوان کی میز تو دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی جس پر بیک وقت تقریباً ساٹھ آدمی بیٹھ کر کھانا کھا سکتے تھے۔ پورے کمرے کی دیواروں کے ساتھ ریشمی پردے لٹک رہے تھے۔

ہم دونوں کرسیوں کے پاس کھڑے تھے کہ سامنے کی دیوار کا پردہ ہٹا اور ڈاکٹر نستور نہایت ہی باوقار انداز میں چلتا ہوا آخری کرسی کے پاس آکر رُکا اور بولا۔ ''مجھے خبر ہے کہ آپ لوگ کئی دن سے بھوکے ہوں گے۔ لہٰذا اتنی جلدی میں یہی کچھ تیار کرا سکا ہوں۔ شروع کیجئے۔''

پھر وہ خود بھی بیٹھ گیا۔ میرے اور یوسف تشیک کے بیٹھتے ہی دائیں جانب کے پردے کے پیچھے سے دو نہایت خوبصورت لڑکیاں ہاتھوں میں ٹرے لئے ہوئے نمودار ہوئیں۔ انہوں نے ایک ایک ٹرے ہم دونوں کے سامنے رکھی اور پھر واپس جدھر سے آئی تھیں، چلی گئیں۔

میں نے کھانا شروع کرنے سے پہلے رمنا اور راجیشی کے لئے ادھر ادھر دیکھا۔

ڈاکٹر نستور نہ جانے کیسے میرے دل کی بات جان گیا اور نہایت ہی دلفریب مسکراہٹ سے بولا۔ ''نوجوان! اپنے ساتھیوں کی طرف سے فکرمند مت ہو۔ رمنا کا ٹریٹمنٹ ہو رہا ہے۔ اس کے جسم میں پانی بالکل نہیں رہا۔ اس کی بیوی راجیشی اس کے پاس ہے۔ وہ کھانا کھا چکی ہے۔''

''کیا اس جزیرہ پر اسپتال موجود ہے؟'' یوسف تشیک نے پوچھا۔

''نہیں، یہ جزیرہ ویران ہے۔ اس جزیرہ پر جو کچھ ہے بس میری رہائش گاہ ہے۔'' ڈاکٹر نستور نے جواباً کہا۔

''آپ یہاں تنہا رہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں تنہا آیا تھا۔'' ڈاکٹر نستور نے جواب دیا۔ ''لیکن اب میں تنہا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ اور بھی کئی لوگ ہیں۔''

''آپ......آپ......کیا کرتے ہیں؟'' میں نے جھجکتے ہوئے یہ سوال کیا۔

''ہاں، اب تم نے مطلب کی بات کی ہے۔'' ڈاکٹر نستور نے ہنس کر جواب دیا۔ ''لیکن یہ جاننے سے پہلے بہتر ہے کہ آپ لوگ پیٹ بھر کر کھانا کھا لیں۔''

یہ سن کر میں اور یوسف تشیک گردن جھکا کر کھانا کھانے لگے۔

☆☆☆

ڈاکٹر نستور خوش اخلاق اور وجیہہ شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی چال ڈھال اور انداز گفتگو سے ایک عجیب قسم کی انفرادیت کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کی عمر پچاس ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ سر کے بال جس قدر سفید تھے، گھنے ابرو اور نوکیلی مونچھیں اسی قدر سیاہ تھیں۔ اس کے

رخساروں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں۔ ناک تیکھی اور ٹھوڑی مضبوط تھی۔

ڈاکٹر نستور مغرب کا رہنے والا تھا۔ ڈاکٹری تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ لوگوں کے علاج معالجہ میں مصروف ہو گیا۔ عمر کا کچھ حصہ گزرنے کے بعد اس نے سوچا کہ انسان مرتا کیوں ہے۔ برسہا برس تک وہ موت کے اسباب جاننے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اس کے دماغ میں ایک نئی سوچ نے جنم لیا۔ اور اپنی اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر اس نے مہذب دنیا کو خیر باد کہا اور اس ویران جزیرہ میں آکر آباد ہو گیا۔

☆☆☆

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم تینوں طعام گاہ کے ایک کونے میں پڑی ہوئی کرسیوں پر آکر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر نستور چند منٹ تک ہمارے چہروں کو دیکھتا رہا۔ اس عرصہ میں دیوار پر پڑے ہوئے پردے کے پیچھے سے دوبارہ لڑکیاں برآمد ہوئیں اور خاموشی سے برتن اٹھا کر واپس چلی گئیں۔

ڈاکٹر نستور نے سلسلۂ کلام اس طرح شروع کیا۔

''دوستو! میں اس جزیرہ کا مالک ہوں۔ یہ جزیرہ دنیا کے نقشے پر شاید ہی موجود ہو۔ کیوں کہ یہ کوئی تیس برس قبل سمندر کی تہ سے خود بخود ابھر آیا تھا۔ اس کے ابھرنے کے فوراً بعد ہی میں نے اس پر قبضہ جما لیا تھا۔ اس لئے کہ میں انسانیت کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔'' وہ گلا صاف کر کے بولا۔ ''اور مہذب دنیا میں رہ کر یہ ممکن نہیں تھا کہ میں اپنے تجربات جاری رکھ سکتا کیوں کہ اس دنیا میں خود غرض لوگوں کی

کمی نہیں جو کسی بھی شخص کی نایاب ایجاد کو اپنے نام سے منسوب کرنے میں ذرا بھی ہچکچاتے نہیں ہیں۔''

تو آپ نے اپنی ایجاد کی خاطر اس جزیرہ پر رہائش اختیار کر لی۔ میں نے نہایت خوش دلی سے کہا۔ لیکن وہ کون سی ایسی ایجاد ہے جس کی خاطر آپ نے دنیا چھوڑ کر اس جزیرہ پر رہنا پسند کیا۔ میں نے پوچھا۔

''میری ایجاد سب سے انوکھی ہے۔'' ڈاکٹر نے فضا میں ہاتھ لہرا کر کہا۔ ''میں اپنی جس تھیوری پر تجربات کر رہا ہوں، اگر اس کے نتائج حوصلہ افزا نکلے تو ساری دنیا میرے قدموں میں ہوگی۔'' آخری جملہ اس نے نہایت ہی جذباتی لہجے میں کہا۔

''آخر، کون سی تھیوری ہے؟ کون سی ایجاد ہے؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''تم میری تھیوری جاننے کے بارے میں بہت زیادہ بے چین معلوم ہوتے ہو۔''

''ہاں، کیوں کہ میں بھی سائنس سے دلچسپی رکھتا ہوں۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''میں بھی مادہ کو سرچشمۂ حیاتِ انسانی سمجھتا ہوں۔''

''مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی۔'' ڈاکٹر نستور نے مسرت سے کہا۔ ''تم یقیناً کام کے آدمی ہو۔'' پھر وہ تھوڑا سا ہم دونوں کی طرف جھکا اور نہایت ہی فخریہ لہجے میں بولا۔ ''میں آدمی بناتا ہوں۔''

''لاحول ولاقوۃ الا باللہ!'' یوسف تشکیک جو ابھی تک خاموش تھا نفرت سے

بولا۔

"تو......تم مذہبی آدمی ہو۔" وہ یوسف تشیک سے مخاطب ہوا۔ "میرے تجربے کی بنیاد بھی مذہب ہی ہے۔"

"وہ......کیسے؟" یوسف تشیک نے زہر خند لہجے کے ساتھ پوچھا۔

"دنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں۔" وہ خلاء میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "وہ سب موت کے بعد ایک اور زندگی کا تصور پیش کرتے ہیں۔"

"یعنی، آپ فنا پر یقین نہیں رکھتے۔" میں نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

"یہ حقیقت ہے نوجوان۔" ڈاکٹر نے کرسی پر پہلو بدل کر کہا۔ "کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ زندگی کیسی ہے، اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسان مر کر بھی نہیں مرتا۔"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"اس بات کو تم مختصراً اس طرح سمجھ سکتے ہو کہ کائنات جن عناصر سے مل کر بنی ہے اب تک ان کی تعداد سو ۱۰۰ سے زیادہ ہو چکی ہے۔" ڈاکٹر نستور نے جواب دیا۔ "یا یوں سمجھو کہ اس کائنات میں اب تک سو ۱۰۰ سے زائد عناصر کا پتہ چلایا جا چکا ہے لیکن ایک عنصر ایسا بھی ہے کہ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیا ہے، کیسا ہے۔ جانتے ہو، وہ کیا ہے؟' اس نے پوچھا۔

"وہ......وہ تو رُوح ہے۔" یوسف تشیک نے جواب دیا۔

"بالکل ٹھیک کہا تم نے۔" وہ خوش ہو کر بولا۔ "روح کے بارے میں یہ مصدقہ حقیقت ہے کہ وہ کبھی فنا نہیں ہوتی حیات کا یہ ایسا عمل ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔"

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے کہا۔

☆☆☆

انسان نے آدمی بنایا

"بات بہت سیدھی سی ہے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "زندگی کا عمل ایک مخصوص طریقہ سے ہوتا ہے۔"

"بات عمل کی نہیں، تخلیق کی ہے۔" یوسف تشیک نے اُسے ٹوکا۔

"تم بہت زیادہ ہوشیار ہو!" ڈاکٹر نستور نے تحسین آمیز نظروں سے یوسف تشیک کو دیکھ کر کہا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "میں بھی تخلیق کے بارے میں ہی بتا رہا تھا...... کہ میں آدمی تخلیق کرتا ہوں۔"

"ناممکن...... قطعی ناممکن!" یوسف تشیک اسی طرح نفرت سے بولا۔

"تم...... تم...... آدمی نہیں بنا سکتے۔"

"کیوں...... نہیں بنا سکتا؟" ڈاکٹر نستور نے چڑ کر جواب دیا۔ پھر وہ دائیں ہاتھ کا مُکّہ کرسی پر مار کر بولا۔ "جب مرغی کے بغیر انڈے میں سے چوزہ نکل سکتا ہے تو شِکمِ مادر کے بغیر آدمی بھی پیدا ہو سکتا ہے۔"

"مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں آتا۔" یوسف تشیک نے کہا۔ "انسان "آدمی" بنانے لگے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔"

"تمہیں میری بات پر یقین کرنا چاہیئے۔" ڈاکٹر نے اپنے الفاظ پر زور دے کر کہا۔ "انسان چاہے تو سب کچھ کر سکتا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ نہایت ہی تیزی سے اٹھا اور قریبی دیوار کے پاس پہنچ کر ایک بٹن دبایا۔ بٹن دبانے کے ساتھ ہی سامنے کی دیوار دو سمتوں میں سمٹ گئی۔ اب ہمارے سامنے ایک بڑا سا ہال تھا جس میں کئی لمبی لمبی میزیں پڑی ہوئی تھیں۔ اور ان میزوں پر شیشے کے قد آدم مرتبان رکھے ہوئے تھے۔ یہ مرتبان سینکڑوں نہیں، بلکہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ اور ان سب میں "افزائشِ انسانی" ہو رہی تھی۔

"دیکھو...... اس حقیقت کو غور سے دیکھو......!" ڈاکٹر نے نہایت ہی جذباتی لہجے میں ہم دونوں سے کہا۔

میں اور یوسف تشیک لپک کر ان میزوں کی طرف بڑھے۔ ہم دونوں حیرت سے آنکھیں پھاڑے ان مرتبانوں کو دیکھ رہے تھے۔

ان مرتبانوں میں ایک دن سے لے کر نو ماہ تک کے انسانوں کی افزائش ہو رہی تھی۔

"یہ میری تخلیق ہے!" ڈاکٹر ہمارے قریب آ کر بولا۔ "اب تو یقین آ جانا چاہیے کہ میں انسان تخلیق کرتا ہوں۔ یہ میری عظیم لیبارٹری ہے۔" اس نے فضا میں ہاتھ پھیلا کر کہا۔ "اور یہاں دو ہزار انسان "پرورش" پا رہے ہیں۔"

اس کی بات کے جواب میں یوسف تشیک نے میری طرف اور میں نے یوسف تشیک کی طرف اس طرح دیکھا جیسے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں کہ یہ خواب تو نہیں ہے......

ڈاکٹر نستور نے انکشاف کیا کہ وہ بیس سال تک "پیدائشِ انسانی" کی تھیوری پر غور و خوض کرتا رہا اور بالآخر "آدمی" بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

اس سے قبل وہ تقریباً ڈیڑھ سو آدمی بنا چکا تھا جن میں وہ لڑکیاں بھی شامل تھیں جو کسی نہ کسی کام کے بہانے ہمارے سامنے آتی رہیں۔

''تمہاری اس تخلیق کا جواب نہیں۔'' میں نے ڈاکٹر کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ''تم بہت عظیم ہو۔ تمہارے اس کارنامے پر آئندہ نسلیں بھی فخر کریں گی۔''

''ہاں، میں عظیم ہوں!'' ڈاکٹر نے عالمِ بے خودی میں کہا۔ ''میری تخلیق پر نسلِ انسانی فخر کرے گی۔ میری ایجاد سے کوئی بھی شخص بے اولاد نہیں رہے گا۔''

''آپ کی ایجاد نسلِ انسانی بڑھانے میں بڑی ہی مددگار ثابت ہوگی۔'' میں نے احترام سے کہا۔ ''یہ بانجھ پن کا بھی علاج ہے۔''

''بالکل درست کہا تم نے۔'' ڈاکٹر نے اسی انداز سے جواب دیا۔

''لیکن...... یہ سب کس طرح اور کیوں کر ممکن ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر تم انسان کی پیدائش کے عمل سے واقف ہو تو سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔'' اس نے جواب دیا۔

پھر اچانک یوسف تشیک سے مخاطب ہوا۔ ''کہو دوست میرا یہ تجربہ کیسا ہے؟''

''نہایت دل چسپ اور حیرت انگیز تجربہ ہے۔'' یوسف تشیک نے تعریف آمیز لہجہ میں کہا۔

''تو...... تم بھی میری قابلیت مانتے ہو۔ میری ایجاد سے متاثر ہو۔'' ڈاکٹر نے فخر سے کہا۔

''جہاں تک تمہاری قابلیت کا تعلق ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔''

یوسف تشیک نے جواب دیا۔ ''لیکن جہاں تک تمہاری ایجاد کا تعلق ہے۔ وہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔''

''کیا مطلب......؟'' ڈاکٹر نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

''اللہ نے تمہیں جتنا شعور عطا کیا ہے تم نے اتنا ہی کام انجام دیا ہے۔'' یوسف تشیک نے سپاٹ لہجہ میں جواب دیا۔ ''تم نے آدمی کو ''تخلیق'' نہیں کیا بلکہ اس کی پرورش کی جگہ کو بدل دیا ہے۔''

یوسف تشیک کی یہ بات سُن کر ڈاکٹر نستور کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں جیسے کسی نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔ یوسف تشیک نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''روح کی اہمیت سے ہر کوئی واقف ہے۔ حیاتِ انسانی کا یہی اصل سرچشمہ ہے۔ جو کہ تخلیقِ آدم سے لے کر آج تک ہر عورت اور مرد میں جاری و ساری ہے۔ تم نے صرف اتنا کیا ہے کہ اس جوہر کو جسم انسانی سے لے کر شیشے کے مرتبان میں منتقل کر دیا اور بس۔''

''خوب، بہت خوب!'' ڈاکٹر ایک ایسے مرتبان کے قریب کھڑے ہو کر بولے جس میں تین ماہ کا آدمی پرورش پا رہا تھا۔ ''تم نہایت دانش مند اور واحد شخص ہو جو ''میرے تجربے'' کو اتنی جلد سمجھ گئے۔ لیکن تمہیں میری اس دانشمندی کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ میں نے ان مرتبانوں میں شکمِ مادر جیسا ماحول پیدا کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے نشوونما میں کوئی فرق نہیں پڑ رہا ہے۔''

''یہ واقعی ناقابلِ یقین حقیقت ہے۔'' یوسف تشیک نے اُسے خراجِ تحسین پیش کیا۔ ''تم نے پرورشِ انسانی کو متبادل جگہ فراہم کر دی۔''

"صرف یہی نہیں۔" ڈاکٹر وضاحت آمیز لہجے سے بولا۔ اس طریقے سے یہ بھی فائدہ ہے کہ انسان جب چاہے آدمی بنا سکتا ہے۔ اگر ہم موت پر قابو حاصل نہ کر سکے تو کیا ہوا!" ڈاکٹر نے نہایت ہی غرور سے کہا۔ "ہم اپنی تخلیق پر خود ہی قادر تو ہو گئے۔"

"لیکن میں سمجھتا ہوں کہ غیر فطری عمل کے ذریعے جو کام بھی ہو گا اس میں کچھ نہ کچھ خامی ضرور رہ جاتی ہے۔" یوسف تشیک نے اس کے غرور پر چوٹ لگائی۔ "انسان قانونِ فطرت سے ہٹ کر مکمل فائدہ نہیں حاصل کر سکتا۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" اس نے قریب رکھے ہوئے مرتبان پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"انسان جو کچھ بھی بناتا ہے۔" یوسف تشیک سمجھاتے ہوئے بولا۔ "اسے کائنات میں موجود کسی بھی شے کی نقل ہی کہا جا سکتا ہے اور نقل اصل کے مطابق نہیں ہو سکتی اور یہ فرق ہی انسان کو اللہ کی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔"

"میں اللہ کا منکر نہیں ہوں۔" ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔

"لیکن اس کے کام میں دخل اندازی کر رہے ہو۔" یوسف تشیک نے برجستہ ٹوکا۔

"نہیں، بلکہ میں تو اس کے کام کو آسان کر رہا ہوں۔" ڈاکٹر نے گویا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔ "افزائشِ نسل کو آسان بنا رہا ہوں۔"

"اللہ تمہاری مدد کا محتاج نہیں ہے۔" یوسف تشیک نے جواب دیا۔ "تمہاری یہ کوشش ناقص ہے۔"

"تم یہ سمجھتے ہو کہ میری یہ کوشش، میرا یہ تجربہ سب کچھ فضول ہے۔" ڈاکٹر نے کسی قدر جھنجھلا کر کہا۔

"ہاں، کیوں کہ تمہارے بنائے ہوئے آدمی میں خامی ہے۔" یوسف تشیک نے جواب دیا۔ "تمہارے آدمی بے حس ہیں۔ وہ غلاموں کی طرح کام انجام دینے میں مصروف رہتے ہیں۔"

"تم اسے خامی کہتے ہو!" ڈاکٹر نے زور سے ہنس کر اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "یہ تو خوبی ہے۔ یہ سب میرے اشاروں پر ناچتے ہیں۔"

"لیکن ان کا اپنا ذہن کام نہیں کرتا۔" یوسف تشیک نے کہا۔

ڈاکٹر یہ سن کر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایک لہر سی آئی اور گزر گئی۔

"اور جو لوگ اپنے ذہن سے کام نہیں لیتے ان پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔"

"تم نے ٹھیک سمجھا۔" ڈاکٹر دوبارہ طعام گاہ کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "میرے آدمیوں میں یہ خامی ہے۔ لیکن میں اپنے دماغی امراض کے ماہر دوست کے ساتھ مل کر اس مشکل پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

ڈاکٹر کے ساتھ ہی ہم دونوں بھی طعام گاہ میں آ گئے یہاں آ کر ڈاکٹر نے دوبارہ بٹن دبایا اور لیبارٹری کی دیوار دونوں طرف سے آ کر مل گئی۔ اس کے ساتھ ہی حبشی النسل لڑکی کمرہ میں داخل ہوئی۔

ڈاکٹر نے لڑکی سے کہا۔ "مہمانوں کو خواب گاہ میں پہنچا دو۔" پھر وہ ہم سے مخاطب ہوا۔ "دوستو! چاہو تو آرام کر لو، چاہو گھوم لو۔ میں اب ذرا آرام کرنا چاہتا

ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے طعام گاہ سے نکل گیا۔

ایک آراستہ وپیراستہ کمرہ میں، درمیانی میز کے سامنے منحنی سا ڈاکٹر زوب بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے شیشے کے چھوٹے سے برتن میں انسانی دماغ رکھا ہوا تھا۔

میز کی دوسری جانب ڈاکٹر نستور بیٹھا تھا۔ ان دونوں کے اوپر درمیان میں بلب لٹک رہا تھا۔ جس کی روشنی شیڈ میں سے چھن چھن کر میز اور ان دونوں کے چہروں پر پڑ رہی تھی۔ کمرہ میں مکمل خاموشی تھی۔ ان دونوں ڈاکٹروں کی نگاہیں میز پر رکھے ہوئے انسانی دماغ پر جمی ہوئی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دونوں ہلکے گلابی رنگ کے اس گودے میں کچھ تلاش کر رہے ہیں۔

آخر کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر نستور کی آواز نے اس خاموشی کو توڑا۔ وہ ڈاکٹر زوب سے نہایت ہی پریشانی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ "ہم نے آج تک جتنے بھی آدمی بنائے ہیں وہ دماغی لحاظ سے صحت مند نہیں ہیں۔ اور اس کی وجہ صرف یہی سمجھ میں آتی ہے کہ......"

ڈاکٹر زوب نے اس کی بات کاٹ کر کہا "......کہ جو آدمی پیدا کئے جا رہے ہیں وہ فطری تقاضوں کے مطابق نہیں ہیں۔ شکمِ مادر کے باہر انہیں جس ماحول میں پرورش کیا جاتا ہے، گو کہ وہ ماحول شکمِ مادر جیسا ہی ہوتا ہے، پھر بھی وہ مصنوعی ماحول ہوتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اس ماحول میں کوئی نہ کوئی خامی ہے۔" ڈاکٹر نستور نے سوچ کر جواب دیا۔

"یقیناً!" ڈاکٹر زوب نے برجستہ کہا۔

"لیکن......لیکن......وہ خامی کیا ہو سکتی ہے؟" ڈاکٹر نستور نے اسی طرح گہری سوچ سے پوچھا۔

"بس وہ خامی یہی ہو سکتی ہے کہ وہ مصنوعی ماحول کے پروردہ ہیں۔" ڈاکٹر زوب نے اطمینان سے جواب دیا۔ پھر کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر بولا۔ "شکم مادر میں حیاتیاتی جوہر کو جو حرارت درکار ہوتی ہے وہی حرارت تم نے مرتبانوں میں بھی پیدا کر دی ہے لیکن پھر بھی ان مرتبانوں پر باہر کا اثر ضرور پڑتا ہے جس کی وجہ سے جسم میں خامی پیدا ہو جاتی ہے۔" پھر وہ ڈاکٹر نستور کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ "یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ انسانی جلد کی سطح کے نیچے ۳۰ لاکھ سے ۴۰ لاکھ تک ایسی ساختیں ہوتی ہیں جو نہایت ہی خفیف اور حساس ہوتی ہیں۔ اور جو جسم کی ہلکی سے ہلکی آہٹ کو دماغ تک پہنچاتی ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ مصنوعی طریقے سے پرورش پانے والے آدمیوں کے جسم کی سطح کے نیچے کمزوری واقع ہوتی ہے۔" ڈاکٹر نستور نے خلاء میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، میں یہی سمجھتا ہوں۔" ڈاکٹر زوب نے جواب دیا "اس کے علاوہ آنکھ، کان، ناک اور منہ وغیرہ ہیں جو باہر کی دنیا کے حالات دماغ تک پہنچاتے ہیں اور ان ذرائع سے جو معلومات دماغ تک پہنچتی ہیں، دماغ ان وصول شدہ معلومات کے مطابق کسی اقدام کا فیصلہ کرتا ہے۔" پھر اس نے اپنے سامنے میز پر رکھے ہوئے دماغ کے پچھلے حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دماغ کے اس حصے میں دس

سے بارہ ہزار ملین نہایت ہی چھوٹے خلیات ہوتے ہیں جو ہماری شعوری سرگرمیوں کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ اور وہ ممکن ہے......'' وہ الفاظ روک کر دوبارہ بولا۔ ''مصنوعی طریقے سے جو آدمی پیدا ہو رہے ہیں ان کے دماغ کے خلیات میں کچھ کمی بیشی ہو جاتی ہے۔''

''کمی بیشی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' ڈاکٹر نستور نے چونک کر پوچھا۔

''تین نمبر لڑکی ڈراؤنی حد تک طویل القامت کیوں ہے؟'' ڈاکٹر زوب نے مسکرا کر کہا۔ ''صرف اسی وجہ سے کہ دماغی خلیات کے ساتھ ساتھ قد بھی بڑھتا چلا گیا۔''

''لیکن اب وہ صرف مخصوص احکام ہی کے لئے رہ گئی ہے۔'' ڈاکٹر نستور نے کسی قدر پریشانی سے کہا۔

''لیکن ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔'' ڈاکٹر زوب نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے اب تک جو آدمی بنائے ہیں ان میں سے تین نہایت اعلیٰ ذہن ہمارے پاس ہیں۔''

''میں جانتا ہوں۔'' ڈاکٹر نستور نے جواب دیا۔ ''لیکن یہ...... یہ تعداد تو بہت ہی کم ہے۔''

''تم اسے کم سمجھتے ہو!'' ڈاکٹر زوب ہنس کر بولا۔ ''ایک اعلیٰ دماغ ایک نسل پر بھاری ہوتا ہے اور پھر ہمارے پاس تو وہ تین اعلیٰ دماغ ہیں جو کئی نسلوں پر بھاری رہیں گے۔ اگر یہ تینوں دماغ اپنے تجربات میں کامیاب ہو گئے تو یہ دُنیا ہمارے قدموں میں ہوگی۔''

''اور اگر یہ اپنی کوششوں میں ناکام رہے تو؟'' ڈاکٹر نستور نے معنی خیز انداز سے کہا۔

''تو...... وہ آدمی جو لیبارٹری میں پرورش پا رہے ہیں ان میں سے ہمیں اعلیٰ ذہن مل جائیں گے۔'' ڈاکٹر زوب نے نہایت ہی جوشیلے لہجے میں کہا۔ ''ہمیں اپنی کوشش سے ناامید نہیں ہونا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے۔'' وہ ایک دم کرسی سے اٹھ کر بولا۔ ''کہ ہم چند سالوں میں اپنی الگ ایک دنیا بسالیں گے جو اس دنیا سے مختلف ہو گی، بہت مختلف''

''اور وہ دنیا سائنس کی دنیا ہوگی۔'' ڈاکٹر نستور نے اس کی بات پوری کی۔ پھر کرسی سے اٹھ کر بولا۔ ''دوست! میں چاہتا ہوں کہ اس دنیا کے ساتھ ساتھ نظام شمسی پر بھی ہمارا کنٹرول ہو۔''

''بالکل، مجھے تمہاری رائے سے اتفاق ہے۔'' ڈاکٹر زوب نے اس کی تائید کی۔ ''فلکیات کی لیبارٹری تیار ہے۔ اب مجھے صرف تمہارے آدمیوں کا انتظار ہے۔''

اتنا کہہ کر دونوں نے خوش آئند مستقبل کی خوشی میں ایک دوسرے سے نہایت گرم جوشی سے ہاتھ ملایا...... اور کمرہ میں تاریکی چھا گئی۔

ہمیں اس جگہ کوئی تکلیف نہیں تھی۔ ڈاکٹر نستور ہر طرح سے ہمارا خیال رکھتا تھا۔ اس جزیرہ پر صرف ڈاکٹر نستور نہیں تھا بلکہ دوسرے سائنسدان بھی موجود تھے اور یہ وہ لوگ تھے جن کی تھیوری، جن کی ایجاد کو مہذب دنیا نے قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔

وہ سب کسی نہ کسی طرح سے فرار ہو کر اس جزیرہ پر پہنچ گئے تھے اور یہ جزیرہ ایک ایسی بستی تھی جہاں کا ہر فرد نت نئی ایجادات میں مصروف رہتا تھا اور ان سب کا سربراہ ڈاکٹر نستور تھا۔

چند دن بعد ہی مجھے اور یوسف تشیک کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ اس جزیرہ پر ہم مہمان کی حیثیت سے نہیں رہ رہے ہیں بلکہ قیدی ہیں۔ اور ہماری نگرانی کی جا رہی ہے۔ شاید ڈاکٹر نستور کا خیال تھا کہ یہاں سے نکل کر ہم دنیا کو ان سب کے بارے میں بتا دیں گے۔ اس عمارت کا صرف ایک حصہ ایسا تھا جہاں ہم گھوم سکتے تھے۔ اگر کسی اور حصے میں جانے کی کوشش کرتے تو قد آور لڑکیاں راستہ روک لیتیں۔

اُس ایک ملاقات کے بعد ڈاکٹر نستور کی شکل ہم نے نہیں دیکھی۔ شاید وہ اپنے تجربات میں بہت زیادہ مشغول ہو گیا تھا۔ راجیشی اور رمنا کا کہیں پتہ نہیں چلتا تھا۔ اس صورتحال سے گھبرا کر ہم دونوں نے یہاں سے فرار کا منصوبہ بنایا۔ اور پھر...... ایک صبح میں اور یوسف تشیک اس عمارت سے باہر نکل آئے۔

ہم دونوں چاہتے تھے کہ کوئی ایسی کشتی یا تختہ مل جائے جس کے ذریعے دوبارہ سمندر میں سفر کیا جا سکے یا پھر کوئی جہاز اِدھر سے گزرے تو اسے اپنی جانب متوجہ کر لیں۔

لیکن...... باہر نکل کر معلوم ہوا کہ ایسا ممکن نہیں کیونکہ جس پہاڑی پر ڈاکٹر نستور کی رہائش گاہ تھی وہ ہر وقت کُہر کی دبیز تہہ میں دبی رہتی تھی۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کُہر کہاں سے آتی ہے۔ ویسے یوسف تشیک کا خیال تھا کہ سمندر کی لہریں جو کہ ہر وقت اس پہاڑی سے اپنا سر ٹکراتی رہتی ہیں، ان کے جھاگ سے یہ کُہر

بنتی ہے۔

یوسف تشیک کا کہنا تھا کہ یہ سب شیطانی چکر ہے۔ اور اس سے پہلے کہ اس جزیرہ پر عذابِ الٰہی نازل ہو ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیئے۔

عمارت سے نکلنے کے بعد ہم دونوں پہاڑی سے اترنے لگے۔ یوسف تشیک آگے تھا اور کہر میں وہ بہت ہی سنبھل سنبھل کر قدم رکھ رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ ابھی ہم دس بیس گز ہی نیچے اترے تھے کہ اچانک یوسف تشیک کا پاؤں پھسلا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے پکڑنا چاہا اور اس کوشش میں اپنا توازن بھی کھو بیٹھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ ہم دونوں ہی تیزی سے نیچے لڑھکتے ہوئے جا رہے تھے۔

اب نہ تو وہ پہاڑی تھی اور نہ ہی وہ جزیرہ۔

میں اور یوسف تشیک شیشے کی قبروں میں لیٹے ہوئے تھے۔ آنکھیں کھلتے ہی ہم نے اپنے اطراف میں نظریں دوڑائیں یہ ایک بڑا سا ہال تھا اور اس ہال کے درمیان، ہم شیشوں کے خول میں لیٹے ہوئے تھے۔

میں نے اور یوسف تشیک نے آپس میں ایک دوسرے سے بات کرنا چاہی لیکن، ہم دونوں کے درمیان بھی شیشے کی دیوار حائل تھی جس کی وجہ سے آپس میں بات چیت نہیں کر سکتے تھے۔

ہم دونوں کے ہوش میں آتے ہی ہال میں دو بہت ہی لمبے لمبے آدمی داخل ہوئے۔ وہ دونوں ہمارے کیبن کے پاس آ کر نہایت ہی تجسس بھری نظروں سے ہمیں دیکھنے لگے۔ جیسے ہم ان کے لئے انسان نہیں بلکہ کوئی عجوبہ شے ہوں۔

پھر وہ دونوں مُڑے اور تیزی سے واپس چلے گئے۔

ان کے جاتے ہی کیبن میں ایک باریک سی آواز گونجی۔ ''تم لوگ آرام کرو۔ ہمارے سائنسدانوں کا ایک بورڈ تمہارے بارے میں معلومات حاصل کر رہا ہے۔ جب تک معلومات حاصل نہیں ہو جاتیں، تم قرنطینہ میں رہو گے۔''

اس ہدایت کے ختم ہوتے ہی میں نے حیران نظروں سے یوسف تشیک کی طرف دیکھا۔ یہ آواز سوفی صدر احیشی کی تھی۔

یوسف تشیک نے جواب میں اس طرح ہاتھ ہلایا جیسے کہہ رہا ہو کہ یہ تمہارا وہم ہے۔

☆☆☆

سائنسدانوں کے بورڈ نے اپنے ذرائع سے تاریخ کا مطالعہ کیا اور متفقہ طور سے یہ رائے قائم کی کہ ہم کسی سیارے کی مخلوق ہیں جو زمین ہی کی طرح ہے۔ انہیں کسی بھی طرح سے یقین نہیں آتا تھا کہ ہم بھی ان ہی کی طرح زمینی مخلوق ہیں۔ انہوں نے ہم سے فرداً فرداً سینکڑوں سوالات کئے۔ کئی سائنسی تجربوں سے گزارا۔ پھر بھی ان کو تشفی نہیں ہوئی۔ وہ سوچتے تھے کہ ہم ماضی کے پسماندہ لوگ اب تک کس طرح زندہ ہیں۔

بہر حال، ان کے بورڈ نے اجازت دے دی کہ ہم دونوں کے ذہنوں کو ٹٹولا جائے اور ان کے معیار کے مطابق جو ذہن جس شعبہ کے لائق ہو اُسے وہاں منتقل کر دیا جائے اس مقصد کی خاطر ایک بار پھر ہم دونوں کو تجربات کے نازک مرحلوں سے گزارا گیا اور بالآخر ہم دونوں کو نسلِ انسانی کے پیدائشی مرکز میں منتقل کر

دیا گیا۔

یہ دنیا نہایت ہی حیرت انگیز تھی۔

سائنس نے اتنی زیادہ ترقی کر لی تھی کہ انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ انسان نے رفتار پر قابو پا لیا تھا۔ اور اب وہ کہکشاؤں کو کھنگال رہا تھا۔ ضروریاتِ زندگی کی تمام چیزوں کو میکانکی بنا دیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ غذائی ضروریات پر بھی وٹامنز کے ذریعے قابو پا لیا گیا تھا۔

غرض کہ یہ سائنس کی دنیا تھی۔ سائنسدانوں کی دنیا تھی۔ ہر چیز پر سائنس دانوں کی اجارہ داری قائم تھی۔

نسلِ انسانی کی افزائش کے لیے ''بے بی ٹیوب'' کا طریقہ عام رائج تھا۔ لیکن اس پر بھی سائنسدانوں کی عملداری تھی۔ کوئی جوڑا ان کی اجازت کے بغیر یہ کام انجام نہیں دے سکتا تھا اور...... سائنسداں جب بھی مناسب سمجھتے تھے ''آدمی'' کی تخلیق کا کام شروع ہو جاتا تھا۔ اس کے لئے بھی سائنسدانوں کا بورڈ قائم تھا۔ جو سالانہ اموات کے حساب سے پیدائشِ انسانی کرتے تھے۔

اس طریقہ سے یہ ہوا کہ عورت اور مرد کے فطری جذبات ختم ہو کر رہ گئے۔ اب ان دونوں میں ایک دوسرے کے لئے کوئی جاذبیت اور کوئی کشش باقی نہیں تھی۔

یہاں کوئی کسی کا باپ، ماں، بیٹا، بیٹی، بہن یا بھائی نہیں تھا۔

محبت، پیار، شفقت و ہمدردی کا وہ جذبہ جو اللہ نے انسان کی ذات میں رکھ دیا ہے، ان لوگوں میں سرے سے مفقود تھا۔

حُسن کی سحر کاری اور عشق کی دیوانگی سے یہ لوگ قطعی نابلد تھے۔

غرض کہ سائنس کی دنیا کا انسان بس ایک ''مشین'' بن کر رہ گیا تھا۔

مجھے اور یوسف تشیک کو ایک کمپلیکس میں پہنچا دیا گیا جہاں عورت اور مرد کو خاص وٹامنز کھلا کر نسل انسانی کی خاطر تیار کیا جاتا تھا۔

اس بورڈ کے سائنسدان ''آدمی'' بنانے کے ساتھ ساتھ موت پر بھی قابو پانے کی کوششوں میں مصروف تھے اور اس کی خاطر عجیب عجیب طریقے ایجاد کرتے رہتے تھے۔ مثلاً وہ کسی بھی مردہ جسم کے ساتھ بجلی کے تار باندھ کر دوران خون بحال کرنے کی کوشش کرتے یا پھر مُردہ کا سینہ چاک کر کے اس کے دل کی حرکت بحال کرنے کی خاطر دل کی مالش کرنے لگتے۔''

یہ لوگ اپنے مردوں کو دفناتے نہیں تھے بلکہ انہیں صندوق میں بند کر کے ایک چھوٹے سے راکٹ کے ذریعے زمین کے مدار پر بھیج دیتے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جب وہ موت پر فتح حاصل کر لیں گے اور پھر ان جسموں کو دوبارہ زندہ کر لیں گے۔

یوسف تشیک ان کی یہ حرکتیں دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتا رہتا تھا۔ اس کو تعجب تھا کہ کہکشاؤں میں گھومنے والے اس کائنات کے خالق کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں۔، وہ مجھ سے کہتا تھا کہ یہ لوگ اتنے ترقی یافتہ ہونے کے باوجود مذہب سے بیگانہ ہو کر جاہلانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دیکھ لینا ایک نہ ایک دن عذابِ الٰہی انہیں آن دبوچے گا۔

میں اسے سمجھاتا تھا کہ جو لوگ ''آدمی'' بنا سکتے ہیں، چاند اور ستاروں پر کمند پھینک سکتے ہیں ان کو کوئی کیا نقصان پہنچا سکتا ہے۔

اس کمپلیکس میں نہایت ہی تندرست اور خوبصورت جوڑے رہا کرتے تھے۔ اسی کمپلیکس میں موجود نہایت ہی حسین و جمیل لڑکی سے مجھے محبت ہو گئی۔ وہ لڑکی محبت کی لذت سے نا آشنا تھی۔ میں اس سے کتنی ہی پیار بھری باتیں کرتا، اس کے حسن کی تعریف و تحسین کرتا مگر وہ صرف خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہتی۔

سائنسی معاشرہ کی پروردہ یہ لڑکی بھلا محبت کی شناسا کیا ہوتی! لیکن ایک بار اس محبت کی لذت سے آگاہ ہونے کے بعد اس نے شرم و حیا کی حدوں سے باہر آنا شروع کر دیا۔ دراصل وہ شرم و حیا سے بھی اتنا ہی ناواقف تھی جتنا جذبۂ محبت سے۔ میرے لئے اب دشوار تھا کہ میں اسے شرم و حیا سے کس طرح آگاہ کروں۔ بلکہ یہ کام یوسف تشیک کے لئے بھی آسان نہیں تھا۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، وہ لڑکی میرے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ اور اس کے تعلقات میرے ساتھ مستحکم ہوتے جا رہے تھے۔ اب وہ اپنے بیشتر اوقات میرے کمرے میں گزارا کرتی تھی۔

جب یوسف تشیک نے دیکھا کہ لڑکی کا میلان میری طرف بہت زیادہ ہے تو اس نے مجھے گناہ کا احساس دلایا اور لڑکی کو سمجھاتے ہوئے نصیحت کے طور پر اس سے کہا۔ ''انسان خواہ کتنی ہی ترقی کر لے لیکن وہ سب سے بڑی سپر پاور کے تابع رہتا ہے۔ انسان کو یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ ایک سب سے بڑی طاقت بھی ہے، جس کے سامنے اسے جواب دینا ہے اور وہ سب سے بڑی طاقت، سب سے بڑی سپر پاور ''اللہ'' ہے۔''

''اللہ؟ یہ اللہ کون ہے؟'' لڑکی نے انجانے انداز سے پوچھا۔

''اللہ وہ ہے جس نے انسان کو پیدا کیا، جس نے یہ ساری کائنات بنائی ہے۔'' یوسف تشیک نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تم نہ جانے کس اللہ کی بات کررہے ہو۔ میں تو خود بخود لیبارٹری میں پیدا ہو گئی تھی جس طرح یہ کائنات خود بخود وجود میں آ گئی۔'' لڑکی نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

''کوئی شے کس طرح خود بخود وجود میں آ سکتی ہے؟'' یوسف تشیک نے پوچھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اُسے سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔

''سنو! آج سے انگنت سال پہلے، سورج، فضائے بسیط میں اکیلا تھا۔'' لڑکی یوسف تشیک کو سمجھانے کے انداز میں بولی۔ ''پھر اسی سورج کا لاوا بہہ نکلا۔ سورج اور اس لاوے میں کشمکش ہونے لگی۔ جس کے نتیجے میں لاوا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سورج ہی کے گرد چکر کاٹنے لگا۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہ ٹکڑے ٹھنڈے ہوتے چلے گئے۔ سورج کے یہی ٹکڑے عطارد، مشتری، زہرہ، مریخ، زحل، یورینس، نیپچون، چاند اور زمین بن گئے۔

نظامِ شمسی کی یہ دلیل سن کر یوسف تشیک میری شکل دیکھنے لگا۔ پھر سوچ کر بولا۔ ''لیکن یہ بھی تو سوچو کہ سورج کو بھی تو بنانے والا کوئی ہوگا۔''

''وہ کون ہوگا؟'' لڑکی نے آنکھیں مٹکا کر پوچھا ''سورج تو خود ہی آگ کا ایک گولہ ہے۔''

''تم اس بات کو اپنے دماغ سے نکال دو کہ کوئی چیز خود ہی وجود میں آ جاتی ہے۔'' یوسف تشیک نے ایک بار پھر سمجھایا۔ ''یہ کائنات اور اس کائنات میں پائی جانے والی کوئی بھی شے خود ہی وجود نہیں پاتی ہے بلکہ انہیں وجود دینے والا ان کا خالق

موجود ہے اور وہ اللہ ہے۔''

''تمہاری یہ تھیوری میری سمجھ میں نہیں آتی۔'' لڑکی نے پریشانی سے کہا۔

''اگر اللہ ہے تو وہ کہاں ہے؟''

''وہ آسمانوں پر ہے۔'' یوسف تشیک نے فوراً ہی جواب دیا۔

''تم کس آسمان کی بات کر رہے ہو؟'' لڑکی نے تعجب سے کہا۔ ''میں تو پورا نظامِ شمسی گھوم چکی ہوں۔ مجھے تو اللہ کہیں بھی نظر نہیں آیا۔''

☆☆☆

سائنس کا عذاب

لڑکی کی بات سن کر یوسف تشیک نے اپنا سر پکڑ لیا پھر دوسرے ہی لمحہ اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے نہایت ہی پُر اعتماد لہجے میں بولا۔ ''تم اللہ کو دیکھوگی، اس سے ملوگی؟''

اور اس سے پہلے کہ لڑکی کچھ جواب دیتی، کمرے میں نہایت باریک آواز گونجی۔ ''زولو! یہ مذہبی ذہن کا آدمی ہے۔ تم اس کی بات نہیں سمجھوگی۔''

''راجیشی ......!'' یوسف تشیک نے آواز کو مخاطب کیا۔

''تشیک ......!'' اس کا آدھا نام لے کر پکارا گیا۔ ''تم ہماری دنیا کے لوگوں کو نہیں ورغلا سکتے ہو۔''

اس کے بعد کمرہ میں ایک دبا ہوا قہقہہ بلند ہوا اور دو قوی ہیکل آدمیوں نے اندر آکر مجھے اور یوسف تشیک کو بازوؤں سے پکڑ لیا۔

مجھے اور یوسف تشیک کو ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

اس کمرہ میں سامنے کی جانب دیوار کے ساتھ چھوٹا سا اسٹیج تھا۔ اور اسٹیج پر اوپر کی جانب سے رنگین روشنیاں اس طرح سے پڑ رہی تھیں کہ روشنیوں کی دیوار سی بن گئی تھی۔ اس دیوار کے پیچھے کیا تھا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ دونوں قوی ہیکل آدمی ہمیں چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے۔ ان کے جانے کے کچھ دیر بعد روشنی کی دیوار ختم ہوگئی اور

اسٹیج پر ایک بڑی سی کرسی پر ڈاکٹر نستور نہایت ہی زرق برق لباس پہنے بیٹھا تھا۔ اس کے پہلو میں راجیشی بھی اس ہی جیسا لباس پہنے بیٹھی تھی۔

ڈاکٹر نستور اور راجیشی کو دیکھ کر ہمیں خوشی ہوئی کیونکہ یہ دونوں ہی شناسا تھے۔ تعجب اس بات کا تھا کہ یہ دونوں تو جزیرہ پر تھے اور اب جب کہ دنیا ہی بدل چکی ہے یہ دونوں وہاں سے آگئے۔

ڈاکٹر نستور نے ہمیں سوچ میں گم دیکھ کر کہا۔ دوستو! تم شاید ماضی کو یاد کر رہے ہو۔ لیکن میں نے ماضی کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ میں اپنے ساتھیوں کی مدد سے آگے، بہت آگے، نکل آیا ہوں۔ اتنا آگے کہ اگر تمہاری طرح کے لوگ سو سال تک دن اور رات محنت کرتے رہیں تو شاید مجھ تک نہ پہنچ سکیں۔

''یعنی وہ محل، وہ جزیرہ سب کچھ ختم ہوگیا؟'' میں نے حیرانگی سے کہا۔

''وہ سب کچھ موجود ہے۔'' ڈاکٹر نستور نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''اس جزیرہ ہی پر میری حکومت ہے۔ یہ میری سائنس کی دنیا ہے۔ میں یہاں کا بے تاج بادشاہ ہوں۔''

''لیکن یہ سب کس طرح اتنی جلدی ہوگیا۔ پہاڑی سے گرنے کے بعد ہم کتنی دیر بے ہوش رہے؟'' میں نے اس طرح حیرانگی سے پوچھا۔

''ہاں، سوچو یہ سب کیسے اتنی جلدی ہوگیا۔'' ڈاکٹر نستور نے الٹا مجھ ہی سے سوال کیا۔ پھر چند لمحہ توقف کے بعد کہا۔ ''شاید یہ بات اتنی جلدی سمجھ میں نہ آئے۔ دراصل میں نے اور میرے ساتھیوں نے کام کی رفتار بڑھا دی تھی۔ اب ہر کام گھنٹوں اور منٹوں میں ہونے لگا تو وقت پیچھے رہ گیا۔ سال بعد جو چیزیں ایجاد ہونا

تھیں وہ ہم نے آج ہی کر لیں۔"

"یہ...... یہ...... کیسے ممکن ہوا!" میں نے تعجب سے کہا۔

"یہ سب میرے، پیدا کئے ہوئے آدمیوں، کے اعلیٰ ذہنوں کا کارنامہ ہے۔" ڈاکٹر نستور نے مسرت سے کہا۔ پھر سنجیدگی سے بولا۔ "میں جانتا تھا کہ تمہارے ساتھی کا ذہن میری ترقی قبول نہیں کرے گا۔ لہٰذا میں نے تم دونوں کو فرار کا موقع دیا۔ اور جب تم پہاڑی سے اتر رہے تھے تو تمہیں بے ہوش کر دیا گیا اور تم ایک سال تک بے ہوش رہے ہو۔"

"ایک سال تک!" یوسف تشیک اور میرے مُنہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ہاں، اور اس ایک سال میں دیکھو میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوں۔" ڈاکٹر نستور نے فخر سے کہا۔ "پھر، میں تم دونوں کو ہوش میں لایا۔ میں نے سمجھا تھا کہ تمہارے ذہن بدل چکے ہوں گے۔ لہٰذا میں تمہیں بھی سائنسی معاشرہ میں کوئی مقام دوں لیکن......" اس نے یوسف تشیک کی جانب ہاتھ کا اشارہ کر کے کہا۔ "تمہارا ذہن ابھی تک نہیں بدلا۔ تم ابھی تک اَن دیکھے خدا کی باتیں کرتے ہو۔"

"میں اپنے اللہ کو نہیں بھول سکتا۔" یوسف تشیک نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں اس کائنات کے موجد کو فراموش نہیں کر سکتا۔ تم نے جو کچھ ترقی کی ہے وہ سب اُس اللہ ہی کی مرہونِ منت ہیں۔"

"پھر، وہی بات......" ڈاکٹر نستور نے اسے ٹوکا۔ "تم اپنے ذہن سے اللہ کا تصوّر نکال دو۔ جو کچھ ہے وہ یہ انسان ہی ہے۔ میں نے جو ترقی کی ہے اس میں تمہارے اللہ کا دخل بالکل نہیں ہے۔"

"تم حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتے۔" یوسف تشیک نے جواب دیا۔ "اللہ کی مرضی کے بغیر تو تم بھی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتے۔"

"تم بہت ہی پست ذہن کے آدمی ہو!" ڈاکٹر نستور نے قدرے نفرت سے کہا۔ "انسان مختارِ کُل ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ اپنے دماغ اور ذہن سے کیا ہے۔"

"ڈاکٹر!" یوسف تشیک نے ذرا سخت لہجہ میں کہا۔ "اللہ غرور کو پسند نہیں کرتا۔ کیوں کہ غرور بھی اس کے لئے ہی زیبا ہے۔ دوسروں کو یہ زیب نہیں دیتا۔ غرور کرنے والوں کو اللہ صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے۔"

"اوہو! یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔" ڈاکٹر نستور نے طنزاً قہقہہ لگا کر کہا۔

"تو اب جان لو۔" یوسف تشیک نے اپنی بات جاری رکھی۔ "تمہاری ترقی نے تمہیں غرور میں مبتلا کر دیا ہے اور تمہارے اندر فرعونیت پیدا ہو گئی ہے۔"

"وہ بہت بڑا سائنسدان تھا۔" ڈاکٹر نے اس کی بات کاٹ کر طنز کیا۔

"ہاں، لیکن وہ بھی تمہاری طرح" یوسف تشیک نے ڈاکٹر کی جانب ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اللہ کا شکر گزار ہونے کی بجائے اپنی عقل و دانش اور فہم و فراست پر گھمنڈ کرتا تھا۔ اور نتیجہ میں اس کا اور اس کے ساتھیوں کا جو انجام ہوا تم اس سے ضرور باخبر ہو گے...... دریا کے بیچ میں ان کو ڈبو دیا گیا۔"

"میرے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا۔" ڈاکٹر نے نہایت ہی متکبرانہ انداز میں کہا۔ "اُدھر دیکھو!" اس نے اپنی بائیں جانب اشارہ کیا۔

اس کے ساتھ ہی دیوار بیچ میں سے شق ہو گئی اور موجیں مارتا ہوا سمندر نظر

آنے لگا۔ سمندر کے کنارے پر ایک چھوٹی سی توپ نما مشین رکھی ہوئی تھی جس کی نالی کا رُخ سمندر کی جانب تھا اور ایک نہایت ہی طویل قد آدمی اس کے قریب کھڑا ہوا تھا۔

"یہ میری معمولی سی ایجاد ہے۔" ڈاکٹر نستور اس ہی انداز سے بولا۔ "اور میں تمہارے اللہ کے اس سمندر کو منٹوں میں غائب کر سکتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر اس نے طویل قد آدمی کو اشارہ کیا۔ اس شخص نے توپ کی پالٹ میں لگا ہوا ایک لیور سا دبایا اور اس کے ساتھ ہی شوں شوں کی مدھم سی آواز نکلنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ توپ کی نالی سے ہوا خارج ہو رہی ہے۔ پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے سمندر کا پانی غائب ہونے لگا میں تعجب سے آنکھیں پھاڑے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ یوسف تشیک کی بھی نگاہیں اسی طرف تھیں۔ لیکن اس کے چہرے پر کسی قسم کے بھی تاثرات نہیں تھے۔

جب سمندر کے بیچ میں خشکی کی ایک پٹی سی نمودار ہوگئی تو ڈاکٹر نستور ہنس کر بولا۔ "کہو دوست! میری ایجاد کیسی ہے؟ میں سمندر میں راستہ بنا سکتا ہوں یا نہیں؟"

"یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔" یوسف تشیک نے سپاٹ لہجہ میں جواب دیا۔ "تم نے دو ہزار سال قبل اللہ کی عطا کی ہوئی تھیوری پر عمل کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" ڈاکٹر نے چونک کر پوچھا۔

"جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر دریا کے کنارے پہنچے۔" یوسف تشیک نے اسے بتایا۔ "تو اللہ نے انہیں حکم دیا کہ اپنا عصا دریا پر مارو اور جب انہوں نے ایسا کیا تو دریا میں راستہ بن گیا اور وہ بنی اسرائیل کو لے کر دریا

کے پار چلے گئے۔ تم نے بھی وہی ترکیب استعمال کی۔" یوسف تشیک نے مسکرا کر کہا۔ "تم کو معلوم ہے کہ پانی کا مالیکیول آکسیجن اور ہائیڈروجن ہے۔ لہٰذا تم نے اپنے شعور سے ایسی مشین ایجاد کر لی جو پانی کے مالیکیول کو جُدا کر دیتی ہے۔"

"تم نہایت ہی زیرک اور چالاک انسان ہو۔" ڈاکٹر نے کھسیانا ہو کر کہا۔

"یہ محض تمہارا خیال ہے۔" یوسف تشیک نے نرم لہجہ میں جواب دیا۔ "مجھ میں اور تم میں فرق صرف یہ ہے کہ تم ترقی کو اپنے شعور کی معراج قرار دیتے ہو اور میں اسی شعور کو اللہ کی عطا کی ہوئی نعمت قرار دیتا ہوں جس کی بدولت انسان ترقی کرتا ہے۔"

"لیکن یہ تمام ایجادیں ان آدمیوں کے ذہنوں کی پیداوار ہیں جنہیں میں نے بنایا ہے۔" ڈاکٹر نستور نے ہنس کر کہا۔ "اور اس طرح تمہارے اللہ کی وہ نعمت جسے تم شعور کہتے ہو اس کی نفی ہو جاتی ہے۔"

"ادھر دیکھو!" اتنا کہہ کر اس نے دائیں ہاتھ کی جانب اشارہ کیا۔ اب ہمارے سامنے دیوار کی بجائے پہاڑی کا ایک حصہ تھا۔

"میں ان پتھروں کو پگھلا سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے کرسی میں لگے ہوئے ایک بٹن کو دبایا۔ اور اس کے ساتھ ہی پہاڑی پر برقی روشنی اس طرح پڑی جیسے بجلی کوند جاتی ہے اور پھر دوسرے ہی لمحہ پہاڑی جلنے لگی۔

"تمہاری کوئی بھی ایجاد میرے لئے باعثِ حیرت نہیں۔" یوسف تشیک اس سے مخاطب ہوا۔ "اس لئے کہ اللہ نے قرآن میں مادّہ کی اصلیت اور اس کے عمل کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"کیا بتا دیا ہے؟" ڈاکٹر نے چڑ کر پوچھا۔

"کسی بھی شے کو جلانے کے لئے حرارت کی ضرورت ہے۔" یوسف تشیک نے بتایا۔ "اور تم نے روشنی ہی کے ذریعے اس عمل کو انجام دیا ہے اور روشنی اللہ نے بنائی ہے۔"

"یوسف تشیک!" ڈاکٹر نستور نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "تم میری سائنسی ترقی پر مذہب کو ترجیح دے رہے ہو۔ جب کہ ہوا اور پانی پر بھی مجھے کنٹرول حاصل ہے۔"

"اللہ نے انسان کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ اس کائنات سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔" یوسف تشیک نے جواب دیا۔ "پھر انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس لحاظ سے یہ پوری کائنات اس کے کنٹرول میں ہے۔"

"میں آدمی بناتا ہوں۔" ڈاکٹر نستور نے تکبر سے کہا۔

"تم کچھ بھی نہیں بنا سکتے ہو۔" یوسف تشیک نے برجستہ جواب دیا۔ "اگر بنا سکتے ہو تو ہوا بنا کر دکھاؤ، پانی بنا کر دکھاؤ، آگ بنا کر دکھاؤ!" پھر وہ جذباتی لہجہ میں بولا۔ "میرا دعویٰ ہے کہ کوئی بھی انسان مٹی کا ایک ذرّہ بھی نہیں بنا سکتا۔"

"تم سائنس کو چیلنج کر رہے ہو!" ڈاکٹر غصہ سے بولا۔

"نہیں، میں اللہ کی بڑائی بیان کر رہا ہوں۔" یوسف تشیک نے جواب دیا۔

"اللہ!" ڈاکٹر نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگا کر کہا۔ "سنو، غور سے سنو! میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اتنی زیادہ ترقی کر چکا ہوں کہ تمہاری دنیا ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اور کچھ ہی عرصہ بعد ہم تمہاری دنیا کی طرف قدم بڑھائیں گے۔ اور جانتے

ہو سب سے پہلے جو قوم ہمارا نشانہ بنے گی، وہ تمہاری ہی قوم ہوگی۔ کیونکہ یہ دنیا کی واحد قوم ہے جو ہر معاملے میں ان دیکھے اللہ کی بالادستی کو تسلیم کرتی ہے۔" پھر وہ نہایت ہی حقارت سے بولا۔ "اور ایسی پست ذہنیت کے لوگوں کو اس زمین پر رہنے کا حق نہیں ہے۔"

"ڈاکٹر نستور!" یوسف تشیک نے بھی اسے سختی سے مخاطب کیا۔ "تم مادّی ترقی کے زعم میں اللہ کو بالکل بھول گئے ہو لیکن یاد رکھو! جس نے بھی اللہ کے نام لیواؤں کو مٹانے کی کوشش کی وہ خود ہی مٹ گیا۔" پھر وہ نہایت ہی نرم لہجے میں سمجھاتے ہوئے بولا۔ "تم...... اور تمہارے ساتھیوں کو اللہ نے جو صلاحیتیں عطا کی ہیں انہیں اس کے بندوں کی بھلائی پر صرف کرو۔"

"میں تمہیں ایک بار پھر موقع دیتا ہوں۔" ڈاکٹر نستور اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "اپنے ذہن کو تبدیل کر لو، ورنہ نتائج کے خود ذمہ دار ہو گے۔"

پھر وہ راجیشی سے مخاطب ہوا۔ "اپنے ساتھی کو سمجھاؤ۔"

یہ سنتے ہی راجیشی اس کے پہلو سے اٹھ کر ہم دونوں کے پاس آ گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی روشنی کی دیوار دوبارہ قائم ہو گئی۔

اب کمرہ میں یوسف تشیک، راجیشی اور میں رہ گئے تھے۔

آخری دیوار کے پاس چار کرسیاں تھیں۔ راجیشی کا برین واش کر دیا گیا تھا۔ اور اب وہ ڈاکٹر نستور کی معمول تھی۔ اس کو قریب پا کر میرے ذہن میں رمنا کے بارے میں خیال پیدا ہوا لہٰذا میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہارا شوہر رمنا کہاں ہے!؟"

"وہ فضاؤں میں ہے۔" راجیشی نے مختصر سا جواب دیا۔

"فضاؤں میں......؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"وہ مر چکا ہے۔" راجیشی نے بتایا۔ "اور اس کے مُردہ جسم کو زمین کے مدار پر بھیج دیا گیا ہے اور جب بھی ہم لوگ موت پر قابو پالیں گے، اس کو دوبارہ زندہ کر دیا جائے گا۔"

"کیا تم بھی اس فضول سے خیال پر یقین کرتی ہو؟" یوسف تشیک نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔" راجیشی کرسیوں کی طرف بڑھتی ہوئی بولی ڈاکٹر نستور اور اس کے ساتھیوں نے بے انتہا ترقی کی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم بھی ان کے شیطانی منصوبے میں شامل ہو۔" یوسف تشیک نے کہا۔

"حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔" وہ میز کے قریب پہنچ کر بولی۔ "مادہ میں بہت زیادہ طاقت ہے۔ انسان اس کے سہارے جو چاہے کر سکتا ہے۔"

"مجھے تمہاری بات سے انکار نہیں۔" یوسف تشیک نے جواب دیا۔ "مادہ سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مادہ کے خالق کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔"

"تم جانتے ہو۔" وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر بولی۔ "میں مذہبی عورت تھی۔ روحانیت پر مجھے اعتماد تھا۔ لیکن یہ میری بھول تھی کیونکہ میں مادہ کی حقیقت سے ناواقف تھی اور اب جب کہ مادہ کی حقیقت سے واقف ہو چکی ہوں تو یہ سب باتیں بیکار سی معلوم ہوتی ہیں۔" پھر وہ بڑے ہی پیار بھرے لہجے میں سمجھانے کی خاطر

بولی۔ "ایک ان دیکھی ہستی کا تصور تمہیں کیا دیتا ہے۔ اللہ کو ماننے سے ہمیں کیا ملتا ہے۔"

"بہت کچھ ملتا ہے۔" یوسف تشیک نے جواب دیا۔ "انسان کو اللہ نے پیدا کیا، پھر اسے شعور عطا کیا جس کی بدولت انسان......"

"تمہاری اس تھیوری کا جواب ڈاکٹر نستور دے چکے ہیں۔" راجیشی نے اس کی بات کاٹی۔

"نہیں، وہ آدمی نہیں بناتے۔" یوسف تشیک نے اسے سمجھایا۔ "انہوں نے صرف عملِ پیدائش کا مقام بدل دیا ہے۔ وہ تخلیق نہیں کر سکتے۔"

"کیا مطلب؟" راجیشی نے بجھے بجھے لہجے میں پوچھا۔

"اس کائنات میں پیدائش کا جوہر ہے وہ پہلے سے موجود ہے۔" یوسف تشیک نے بتایا۔ "انسان اپنے شعور سے صرف مقامِ پیدائش کو بدل سکتا ہے۔ اس کی مثال تم اس طرح سمجھ لو کہ آم کے درخت کو گملے میں تو لگایا جاسکتا ہے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ آم کا بیج موجود ہو۔ بغیر بیج کے درخت نہیں لگایا جاسکتا۔ اور بیج ہی حیات کا جوہر ہے ڈاکٹر نستور یہ جوہر تخلیق نہیں کر سکتا۔"

"تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔" راجیشی نے ہنس کر جواب دیا۔ "مادہ ذرّات کا مجموعہ ہے اور ذرّہ اپنے اندر خود بے پناہ قوت رکھتا ہے۔" پھر وہ سمجھاتے ہوئے بولی۔ "اسی طرح آدمی ہے جو اَربوں خلیات سے مل کر بنتا ہے اور اس طرح وہ نشوونما کے ساتھ ساتھ حیات پاتا رہتا ہے۔"

راجیشی کی بات سُن کر یوسف تشیک نے بیچارگی سے میری طرف دیکھا۔

"تم اس بات کو اتنی آسانی سے نہیں سمجھ پاؤ گے۔" راحیشی نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ آدمی نو ماہ میں مکمل ہوتا ہے لیکن اس کے جسم میں حیات کی حرارت چھ ماہ میں ہی دوڑنے لگتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ خلیات جو چھ ماہ میں جمع ہوتے ہیں، ان میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ آدمی سانس لینے لگتا ہے۔ تم نے اس کا مشاہدہ ہمارے کمپلیکس میں کیا ہوگا۔"

"بہت غور سے مشاہدہ کیا ہے۔" یوسف تشیک نے طنزیہ کہا۔

"پھر بھی تم مادّہ کی حقیقت اور ڈاکٹر نستور کی برتری کو تسلیم نہیں کرتے ہو۔" راحیشی نے کہا۔

"ڈاکٹر نستور خاک کا ایک پُتلا ہے۔" یوسف تشیک نے جواب دیا۔ "یہ ممکن نہیں کہ میں اللہ کا ہو کر اس کے بندے کی اطاعت کروں۔"

"ٹھیک ہے، تمہیں ہمارے میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔" راحیشی نے کرسی سے اٹھ کر کہا۔ "تمہارے ذہن کا علاج کیا جائے گا۔"

"اس سے بہتر یہ ہے کہ مجھے یہاں سے جانے دیا جائے۔" یوسف تشیک نے کہا۔

"یہ ممکن نہیں کیونکہ تم اس دنیا میں جا کر ہمارے خلاف زہر اُگلو گے۔" راحیشی نے جواب دیا۔ پھر تیز...... تیز قدم اٹھاتی ہوئی اسٹیج پر جا کر کھڑی ہوگئی۔

ہمیں یوں دکھائی دیا جیسے وہ روشنی کی دیوار میں جذب ہوتی جارہی ہے۔

یوسف تشیک سائنسی ترقی کے خلاف نہیں تھا لیکن وہ ہر حال میں اللہ کی برتری کو مقدم سمجھتا تھا۔

اسے میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش کیا گیا۔ میڈیکل بورڈ نے کافی غور و خوض کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس کے دماغی خلیات میں خلل واقع ہوتا رہتا ہے۔ جس کی بنا پر وہ بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ مشاہدہ اس کا علاج قرار دیا گیا اور اس مقصد کی خاطر اسے شعبۂ فلکیات میں بھیج دیا گیا۔ یہاں ایسی دوربینیں اور خوردبینیں نصب تھیں جن کے ذریعے نظامِ شمسی کے پار بھی دیکھا جاسکتا تھا۔

اس کی ڈیوٹی یہ تھی کہ کہکشاؤں کا مشاہدہ کرتا رہے ان کا خیال تھا کہ ستاروں اور سیاروں کے مشاہدے کے بعد اس کے ذہن سے اللہ کا تصور ختم ہو جائے گا۔

اب یوسف تشیک کا زیادہ سے زیادہ وقت کہکشاؤں کے مشاہدے میں گزرتا تھا۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اور زیادہ اللہ کی حمد و ثنا میں مصروف ہوتا جارہا تھا۔ وہ لوگوں سے چیخ چیخ کر کہتا کہ اپنی آنکھوں سے قدرتِ الٰہی دیکھ کر بھی تم لوگ اس اللہ تبارک و تعالیٰ کو نہیں مانتے جس نے آسمان کو بروج سے زینت بخشی ہے۔

لوگ اس کی باتوں پر دھیان دینے کی بجائے اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے۔

زولو امید سے ہو چلی تھی۔ اور جوں جوں دن قریب آتے جارہے تھے اس کے جسم میں تغیر رونما ہوتا جارہا تھا۔ سائنسدانوں کو جیسے ہی علم ہوا کہ زولو کے جسم میں ایک اور جسم نشو و نما پا رہا ہے انہوں نے اس کا معائنہ شروع کر دیا۔

زولو کو شیشے کے ایک ایسے کمرے میں مقید کر دیا گیا جس کی دیوار کے ساتھ

ساتھ متعدد سائنسی آلات لگے ہوئے تھے جو اس کے دل کی دھڑکن، نبض کی رفتار اور دوسرے جسمانی عمل کو ریکارڈ کرتے رہتے تھے۔

سو سال بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ان کے ہاں آدمی فطری عمل کے مطابق پرورش پا رہا تھا۔ میڈیکل سائنسدانوں کا بورڈ نہایت توجہ سے زولو کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ اور یہ بورڈ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو مصنوعی طریقے پر پیدا ہوئے تھے۔ ان کے لئے یہ سب کچھ نہایت ہی حیرت انگیز تھا۔

ڈاکٹر نستور کے حکم پر میری سخت نگرانی شروع کر دی گئی۔ اس کے خیال کے مطابق میں نے ایک نہایت ہی غیر ذمہ دارانہ جرم کیا تھا اور اس جرم کے نتائج اور تحقیق پر ہی میری سزا کا دارومدار تھا۔

میں اپنی نگرانی سے سخت پریشان تھا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ مادّیت کا یہ دور انسانیت کے لئے کس قدر اذیت ناک ہے۔

ڈاکٹر نستور کی دنیا مشینی دنیا تھی۔ حتیٰ کہ آدمی تک مشینی تھا۔ لیکن مشینی دور کی اس گہما گہمی میں وہ سکون، وہ اطمینان نہیں تھا جو باہر کی دنیا کے لوگوں کو میسر تھا۔ یہاں کی ہر چیز مصنوعی تھی اور انسان مصنوعی طریقے سے کتنے عرصے زندہ رہ سکتا ہے۔ ذرا تصور تو کیجئے اس دنیا کا جہاں پیار، محبت، حسن و التفات کچھ بھی نہیں تھا۔ انسان کو اپنی جبلّی فطرت کے مطابق کوئی عمل کرنے کا حق نہیں تھا۔ یہ لوگ دنیا کو اپنے تابع کرنا چاہتے تھے۔ ان کے خیالات سن کر، ان کے معاشرے کو دیکھ کر میں تو کانپ اٹھتا تھا۔

اگر یہ لوگ دنیا پر مسلط ہو گئے تو دنیا کا کیا حشر ہو گا۔ میرے لئے یہ خیال ہی

سوہانِ روح تھا۔ یوسف تشیک کا یہ قول کہ روحانیت کے بغیر مادی ترقی بیکار ہے میری سمجھ میں آتا جا رہا تھا۔ مذہب اور روحانیت واقعی مادی ترقی کو انسان کی بھلائی میں صرف کرنے کا طریقہ بتاتا تھا۔ اور جن ذہنوں میں یہ تصور نہ ہو وہ مادی ترقی کے سہارے انسانیت کو نیست و نابود کرنے کی سوچتے ہیں۔

میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر نستور کی سائنسی دنیا سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اب یہ ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔

پھر ایک دن یوسف تشیک بھاگا بھاگا سائنسدانوں کے پاس آیا۔ اس نے انکشاف کیا کہ کہکشاؤں کا مشاہدہ کرنے والی دوربین کی اسکرین پر ایک سیاہ رنگ کا دھبّہ دکھائی دے رہا ہے جو غیر معمولی طور سے حرکت کر رہا ہے۔ اس کی یہ بات سنتے ہی فلکیات کے ماہرین کا اجلاس طلب کر لیا گیا۔ اور انہوں نے اپنی بنائی ہوئی دوربینوں میں سے سب سے زیادہ طاقت ور دوربین سے اس دھبّہ کا مشاہدہ کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ واقعی دُور، بہت ہی دُور خلا میں ایک دھبّہ حرکت کر رہا ہے۔ یہ واضح نشان پہلی بار مشاہدے میں آیا تھا۔ اس سے قبل بھی اس مشاہداتی دوربین کی اسکرین پر اکثر دھبے حرکت کرتے نظر آ چکے تھے۔ پھر وہ دھبے خود بخود غائب ہو جایا کرتے تھے۔ اور ان کے بارے میں پتہ چلتا تھا کہ وہ شہاب ثاقب تھے۔ لیکن یہ دھبّہ نہ صرف مشاہداتی دوربین کی اسکرین پر آ کر جم گیا تھا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا حجم بھی بڑھتا جا رہا تھا۔

یہ دھبہ خلاء میں اتنی دور تھا کہ ان کی سب سے زیادہ طاقتور دوربین بھی اس کے بارے میں صحیح معلومات نہیں بہم پہنچا سکی۔ وہ لوگ کہکشاؤں کو کھنگال رہے

تھے۔لیکن یہ دھبہ تو ان گنت کہکشاؤں سے بھی بہت دور نظر آ رہا تھا۔اور وہ لوگ اس
کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنے سے قاصر تھے۔

ان کی مادّی ترقی متزلزل ہو رہی تھی۔

انہوں نے اس دھبے کا صحیح پتہ چلانے کی خاطر پہلے سے بھی زیادہ
طاقتور دوربین بنانا شروع کر دی۔اور بالآخر وہ ایسی دوربین بنانے میں کامیاب
ہو گئے جس سے انہیں اس دھبے کے بارے میں پہلے سے بہتر معلومات حاصل ہو
گئیں۔

ادارۂ فلکیات کا ڈائریکٹر پروفیسر...... اور ڈاکٹر نستور اس کمرہ میں داخل
ہوئے جہاں دوسری دوربینوں کے ساتھ ہی ہفتہ بھر قبل تیار کی گئی سب سے زیادہ
طاقتور دوربین کی اسکرین نصب تھی۔اور اس پر یہ دھبہ ٹینس کی گیند کی مانند نظر آ رہا
تھا۔ڈاکٹر نستور اور پروفیسر کے قدموں کی آہٹ سن کر یوسف تشیک نے ان دونوں کی
طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

دونوں چلتے ہوئے سب سے زیادہ طاقتور دوربین کی اسکرین کے پاس پہنچ
کر رُک گئے۔اس دوربین کی اسکرین کے سامنے ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔اس نے
ان دونوں کے قریب آتے ہی ایک کاغذ ڈاکٹر نستور کی طرف بڑھا دیا۔ڈاکٹر اور
پروفیسر دونوں ہی نے ایک ساتھ کاغذ کو دیکھا۔

پھر ڈاکٹر نستور نے وہی کاغذ پروفیسر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔"وہی
پرانی باتیں، وہی پرانی ریڈنگ کہ یہ کوئی سیارہ ہے۔"

"ہاں، ہم تو یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے کہ یہ کوئی سیارہ

ہے۔" پروفیسر نے کسی قدر سوچ کر کہا۔"اور ہماری کہکشاں سے بھی کہیں دور
واقع ہے۔اربوں اور کھربوں کہکشاؤں میں سے کسی ایک کہکشاں سے ٹوٹ کر آ
رہا ہے۔"

"لیکن، اس کا رُخ کدھر ہے؟" ڈاکٹر نستور نے بے چینی سے پوچھا۔

"ابھی تک ہم یہ نہیں معلوم کر سکے ہیں۔" پروفیسر نے جواب دیا۔"ویسے
خلاء میں تیرنے والی کسی بھی شے کی سمت کا پتہ چلانا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک
اس کا زمین سے فاصلے کا تعین نہ ہو جائے۔"

"تو کیا آپ ابھی تک اس کا فاصلہ بھی نہیں معلوم کر سکے ہیں؟" ڈاکٹر نے
پوچھا۔

"میں نے بتایا نا۔" پروفیسر نے جواب دیا۔"کہ یہ انگنت کہکشاؤں میں
سے کسی سے ٹوٹ کر آنے والا کوئی سیارہ ہے اور اس کے فاصلے کا تعین کرنا مشکل ہے
کیونکہ ابھی یہ ہماری کہکشاں میں داخل نہیں ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟" ڈاکٹر نے قدرے تعجب سے کہا۔

"ہم صرف اپنی کہکشاں ہی سے آنے والے کسی بھی سیارہ کے بارے میں
سب کچھ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔" پروفیر نے بتایا۔"اور ابھی یہ ہمای کہکشاں
میں داخل نہیں ہوا ہے۔"

"ویسے اس کی رفتار حیرت انگیز حد تک تیز ہے۔" یوسف تشیک نے قریب
آ کر کہا۔

یہ سنتے ہی وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔یوسف تشیک نے اپنی

بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ابھی یہ سیارہ ہماری کہکشاں میں داخل نہیں ہوا لیکن...... لیکن تمہاری جدید ترین اور سب سے زیادہ طاقت ور دُور بین کی اسکرین پر نظر آ رہا ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' پروفیسر نے پوچھا۔

''اگر تمہاری جدید ترین دور بین اربوں کھربوں کہکشاؤں کے پار جھانک سکتی ہے۔'' یوسف تشیک بولا۔ ''تو تم خود اس بات کا اندازہ لگا لو کہ اس کی رفتار کیا ہو گی کیوں کہ ایک ہفتہ میں یہ ہمیں ٹینس کی گیند کے برابر نظر آ رہا ہے۔''

''چھوڑو پروفیسر۔'' ڈاکٹر نے اکتائے ہوئے لہجہ میں کہا۔

''آخر ہم اس سیارہ کے چکر میں کیوں پڑ گئے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم اپنی دنیا کی طرف توجہ دیں۔''

''میں خلاء میں موجود اس نئے سیارہ کی موجودگی میں صرف ایک مقصد کی خاطر دلچسپی لے رہا ہوں۔'' پروفیسر نے گہری سوچ سے جواب دیا۔

''وہ کیا ہے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''ممکن ہے یہ سیارہ ہمارے کام آ سکے۔'' پروفیسر نے اسکرین پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''اگر ہم اس سیارہ پر قبضہ کر لیں تو......''

''تو یقیناً ہم دنیا کو کنٹرول کر سکیں گے۔'' ڈاکٹر نے خوشی سے اچھل کر جواب دیا۔

''ناممکن۔ قطعی ناممکن!'' یوسف تشیک نے تڑپ کر کہا۔

''کیوں...... کیا اب تم اس سیارہ کی موجودگی سے بھی انکار کرو گے؟'' ڈاکٹر نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ''جسے تم نے خود ہی دریافت کیا ہے۔''

''تم اس پر قبضہ نہیں کر سکتے۔'' یوسف تشیک نے بڑے ہی اعتماد سے کہا۔ ''یہ تمہاری دسترس سے باہر ہے۔''

''لیکن...... کچھ عرصہ بعد یہ ہماری زمینی کہکشاں میں داخل ہو جائے گا۔'' پروفیسر نے ہنس کر جواب دیا۔ ''اور پھر یہ ہماری دسترس سے باہر نہیں ہو گا۔''

''یہ تو تمہاری تباہی و بربادی کا پیغام ہے۔'' یوسف تشیک نے بے دھڑک ہو کر کہا۔

''بے وقوف!'' پروفیسر نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''ستاروں نے بھی کبھی کسی کو نقصان پہنچایا ہے۔''

''اللہ جو چاہے کر سکتا ہے۔'' یوسف تشیک نے اسی طرح جواب دیا۔ ''قرآن پاک میں حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر آسمان سے پتھر برسانے کا ذکر آ چکا ہے۔''

''ماضی اور حال میں بہت فرق ہے۔'' ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ ''تم جس قوم کی بات کر رہے ہو وہ بے وقوف تھی۔ ہم تمہارے اللہ کے پتھروں پر بستیاں بسائیں گے۔''

''تم...... تم...... کچھ بھی نہیں کر سکتے ہو۔'' یوسف تشیک عالمِ بے خودی میں

چلا آیا۔

"پروفیسر!" ڈاکٹر نے پروفیسر کو مخاطب کیا۔ "اس سیارہ کے بارے میں کیوں نہ ذہن کی پرواز سے کام لیا جائے۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔" پروفیسر نے جواب دیا۔ "لیکن ہمارے پاس ایسا ذہن کہاں موجود ہے!"

☆☆☆

منکرینِ الٰہیہ کا انجام

"میری سکریٹری راجیشی کے بارے میں کیا خیال ہے؟" ڈاکٹر نستور نے کہا۔ "اس کی ذہنی پرواز بہت ہی بلند ہے۔ وہ روحانیت کی بھی قائل رہ چکی ہے۔"

"ٹھیک ہے!" پروفیسر نے خوشی سے کہا۔ "تم نے بتایا تھا کہ وہ پرندوں کی بولیاں بھی سمجھتی ہے۔"

پھر اس نے دور بیٹھی ہوئی لڑکی کو حکم دیا کہ راجیشی کو بلایا جائے۔

راجیشی کو ایک نہایت آرام دہ کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ پھر اس کے سر پر فولاد کی ایک ٹوپی اوڑھا دی گئی اور اس کے تاروں کو دُوربین سے ملا دیا گیا۔

اس سارے عمل کے دوران یوسف تشیک خاموش رہا۔

ڈاکٹر نستور نے راجیشی پر تنویمی نیند طاری کی اور اسے Go-Up کا حکم دیا۔ اوپر...... اور اوپر جانے کی تکرار جاری رہی۔ اور جب راجیشی کہکشاؤں کو پار کر کے اُس سیاہ دھبّہ کے پاس پہنچ گئی تو اس نے نہایت حیرت انگیز انکشافات کئے۔ اس نے بتایا کہ:

"یہ ایک سیارہ ہے جو کسی نامعلوم کہکشاں سے لڑھکتا ہوا آ رہا ہے۔ اس کی رفتار روشنی کی رفتار سے بھی زیادہ ہے۔ یہ سیارہ نہایت برق رفتاری سے آگے کی جانب بڑھ رہا ہے۔ یہ نہ صرف حجم میں سورج سے بھی دوگنا ہے بلکہ زمین سے بھی

سینکڑوں گنا بڑا ہے۔''

راجیشی نے بتایا:

''اس کی رفتار کی وجہ سے خلاء میں زبردست ارتعاش سا پیدا ہو رہا ہے جس کی وجہ سے وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی۔

گویا یہ سیارہ ذہنی پرواز پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر نستور نے فوراً ہی راجیشی کو واپسی کا حکم دیا اور اس کے ساتھ ہی پروفیسر کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے ڈاکٹر نستور کا کاندھا پکڑ کر کہا۔ ''اگر یہ سیارہ جلد ہی ہماری کہکشاں میں داخل ہو گیا تو ہم اس سے بہت زیادہ فائدہ اٹھالیں گے۔ بہت زیادہ۔''

''اور اگر خلاء میں یہ کسی اور جانب نکل گیا تو؟'' ڈاکٹر نستور نے سوال کیا۔

''ایسا نہ کہو، ڈاکٹر!'' پروفیسر نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''مجھے اس سیارہ سے بہت سی توقعات ہیں۔ تم جانتے ہو، ہمارے نظامِ شمسی میں کوئی سیارہ ایسا نہیں جہاں ہم مستقل قیام کر سکیں۔ اور ممکن ہے......''

''اس سیارہ پر ہم رہ سکیں۔'' ڈاکٹر نے اس کا جملہ پورا کیا۔

''بالکل!'' پروفیسر نے اسکرین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''پھر کیوں نہ ایسا طریقہ دریافت کر لیا جائے جس سے اگر یہ سیارہ کسی اور جانب بھی جانا چاہے تو نہ جا سکے۔'' ڈاکٹر نے رائے دی۔

''ہاں، ایسا طریقہ معلوم کرنا چاہیئے۔'' پروفیسر نے اس کی تائید کی۔

''تو پھر آج ہی سے یہ کوشش کرنی چاہیئے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''آپ فوراً اس تھیوری پر عمل شروع کر دیں۔''

اس کے بعد اس نے راجیشی کا ہاتھ پکڑا اور کمرہ سے باہر نکل گیا۔ پروفیسر بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔

''انسان کتنا کم عقل ہے کہ خود ہی اپنی بربادی چاہتا ہے۔'' یوسف تشیک بڑبڑایا۔ اور پھر اسکرین پر نظر آنے والے سیارہ کو غور سے دیکھنے لگا۔

پھر کچھ دن بعد زولو ایک بچے کی ماں بن گئی۔ میڈیکل بورڈ نے اُسے دردِ زہ سے بچانے کی خاطر آپریشن کرنا چاہا لیکن پھر انہوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ وہ پیدائشِ انسانی کا فطری طریقہ دیکھنا چاہتے تھے۔

میرا خیال تھا کہ قانونِ فطرت کے اس طریقے سے وہ لوگ خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں گے لیکن ان کی عورتوں نے پیدائش کی تکلیف اٹھانے اور بچہ کو دودھ پلانے کی زحمت گوارا کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر ان کا سائنسی معاشرہ بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ بچہ جب تک پاؤں پاؤں چلنے کے قابل نہ ہو جائے، ماں اس کے لئے وقف رہے۔

پیدائش کے بعد مجھ پر سے نگہبانی کی پابندی ہٹا دی گئی اور سختی سے حکم دیا گیا کہ زولو کے ساتھ بچہ کی پرورش میں ہاتھ بٹاؤں۔ مجھے اس قسم کا تجربہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ زولو تو تھی ہی مشینی عورت۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ بعد بچہ مر گیا۔

بچہ کے پیٹ سے آلائش نکالنے کے بعد اسے حسب دستور فولاد کے صندوق میں بند کر کے فضا میں چھوڑ دیا گیا۔

مجھے بچہ کی موت کا احساس تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے دل میں اللہ کی عطا کی ہوئی نعمت ''محبت'' موجود تھی جب کہ زولو کے لئے یہ کوئی بات ہی نہیں

تھی۔اس کا کہنا تھا کہ بچہ چونکہ ٹیوب میں نہیں پیدا ہوا تھا، اس لیے مر گیا۔

وقت کا سفر جاری تھا۔

یہاں کی آبادی کے شب و روز میں کوئی فرق نہیں آیا۔ عام آدمی پہلے ہی کی طرح مادّہ پرستی میں مصروف تھا۔

انسان جب تک تباہی کے کنارے نہیں پہنچ جاتا، موت کو آنکھوں سے نہیں دیکھ لیتا اسے اس کائنات کے خالق کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا اور پھر، یہ تو ایسی جگہہ تھی جس کا ''کل'' بھی ''آج'' تھا۔ تسخیرِ کائنات کے مالک بھلا کیوں کسی فکر میں مبتلا ہوتے۔

وہ سیارہ ہماری زمین کی کہکشاں میں داخل ہوا۔ شروع میں وہ ایک دیا کی مانند ٹمٹماتا نظر آتا تھا۔ لیکن جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا تھا اس کا زمین سے فاصلہ کم ہونے لگا تھا اور روشنی تیز ہوتی جا رہی تھی۔

ابھی وہ زمین سے دس کھرب میل دور تھا لیکن آسمان پر ستارے کی مانند چمکتا دکھائی دیتا تھا۔

پروفیسر کی دوربین سے وہ فٹ بال کی مانند نظر آتا تھا۔ پروفیسر اس کا گہرا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس کے خیال میں یہ ایک ایسا سیارہ تھا جس پر انسان زندگی گزار سکتا تھا ڈاکٹر نستور اور پروفیسر دونوں کا خیال تھا کہ اگر سیارہ خلاء میں اپنا مدار قائم کر لیتا ہے تو اس پر جلد از جلد قبضہ کر لیا جائے۔

خلاء میں رہ کر وہ پوری دنیا کو کنٹرول کرنا چاہتے تھے اور یہ سیارہ ان کی سب سے بڑی امید تھا۔

اور پھر ایک دن پروفیسر اپنی کرسی سے اچھل پڑا۔ طاقتور ترین دوربین کی اسکرین پر جو کچھ نظر آ رہا تھا نا قابلِ فہم تھا۔ فاصلہ اور رفتار ناپنے والے آلات کانپ رہے تھے یہ سیارہ جسامت میں اتنا بڑا تھا کہ پورے نظامِ شمسی کو ہڑپ کر سکتا تھا۔ اس کی رفتار نا قابلِ یقین حد تک تیز تھی۔ اور...... اور...... اس کا رُخ ہماری زمین کی جانب تھا۔

پروفیسر نے بلا کسی تاخیر کے کرسی کے بائیں جانب لگا ہوا سُرخ بٹن دبا دیا۔ بٹن کے دباتے ہی دور، نزدیک ہر جگہ گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ لوگ اپنا اپنا کام چھوڑ کر شعبۂ فلکیات کی طرف چل پڑے۔

اور پھر کچھ ہی دیر بعد یہ چھوٹا سا کمرہ اس دنیا کے تمام سائنسدانوں سے بھر گیا۔

ڈاکٹر اور راجیشی پروفیسر کے قریب ہی کھڑے تھے یوسف تشیک دھکے کھاتا ہوا آخری دیوار کے ساتھ چپک گیا تھا۔

پورے کمرے میں سناٹا طاری تھا۔ ہر شخص سوالیہ نظروں سے پروفیسر کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے آج پہلی بار ہنگامی طور سے تمام شعبوں کے سائنس دانوں کو بٹن دبا کر طلب کر لیا تھا جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ ''فلک'' کے بارے میں کوئی اہم خبر سنانا چاہتا ہے۔

بالآخر پروفیسر نے مدھم آواز میں کہنا شروع کیا۔ ''دوستو اور ساتھیو! یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہم اتنی زیادہ ترقی کر چکے ہیں جس کی مثال مستقبل میں بھی ملنا مشکل ہے۔ ہمارے خلائی جہاز نظامِ شمسی سے بھی آگے کہکشاں کی تحقیق میں مصروف

ہیں۔لیکن بعض دفعہ اس خلاء میں تغیر بھی ہوتا رہتا ہے۔اور اس کائنات کی موجودگی بھی اس خلا میں تغیر ہی ہے۔"

اتنا کہہ کر اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور پھر دوبارہ بولا۔"یہ خلاء محض خلاء نہیں ہے بلکہ یہ اربوں اور کھربوں سیاروں اور ستاروں کی آماجگاہ بھی ہے۔آج سے چند دن قبل ہم نے خلاء میں ایک دھبہ دیکھا تھا جو کہ اب ایک سیارہ کی حیثیت سے ہماری کہکشاں میں داخل ہو چکا ہے اور ایک عفریت بن کر ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔"

"پروفیسر!" ڈاکٹر نستور نے نہایت پریشانی سے اسے مخاطب کیا۔

"ہاں ڈاکٹر۔" پروفیسر نے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔"وہ سیارہ ہم زمین والوں کے لئے موت کا پیغام ہے۔"

"وہ کس طرح؟" ڈاکٹر نے اسی پریشانی سے پوچھا۔

"ابھی ابھی اعداد و شمار کے ذریعے معلوم ہوا ہے۔" پروفیسر مجمع سے مخاطب ہوا"کہ وہ سیارہ اتنا بڑا ہے کہ ہماری زمین جتنی سو زمینیں اس میں سما سکتی ہیں اور ہمارے پیمانے اس کی رفتار ناپنے سے قاصر ہیں۔""لیکن" اس نے کسی قدر تسلی آمیز لہجے میں کہا۔"اس سیارہ کے راستے میں اس سے بڑا کوئی سیارہ نہیں آیا تو بھی اسے زمین تک پہنچنے میں بیس دن لگ ہی جائیں گے۔"

"بیس دن!" مجمع میں کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

"ہاں، بیس دن۔" پروفیسر نے دوبارہ کہا۔"اور یہ مدت کافی ہے۔" پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔"اس دوران ہمیں اپنے بچاؤ کے لیے سوچنا ہو

گا۔اس زمین کو بچانے کے لئے کچھ کرنا ہوگا۔"

"آہاہا......" یوسف تشیک زور سے ہنسا اور بولا"تم تو اس سیارہ کو اپنے لئے نیک فال سمجھ رہے تھے،تم تو اس پر قبضہ کر کے دنیا کو کنٹرول کرنا چاہتے تھے۔"

"یہ مذاق اڑانے کا نہیں، کچھ کرنے کا وقت ہے۔" پروفیسر نے اسے جواب دیا۔"پہلی بار ہمارے اندازے غلط ثابت ہوئے ہیں۔لیکن مجھے امید ہے کہ ہمارے پاس ایسے ذہن موجود ہیں جو اس مشکل پر قابو پالیں گے۔"

"اس مشکل پر قابو پانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔" یوسف تشیک نے اسی طرح بلند آواز سے کہا۔"وہ یہ کہ اللہ کے سامنے عجز وانکساری سے سر جھکا دو۔"

"بے وقوف!" ڈاکٹر نستور نے حقارت سے کہا۔پھر وہ پروفیسر سے مخاطب ہوا۔"کیوں نہ اس سیارہ کا رُخ موڑ دیا جائے۔"

"ہاں، اس سیارہ کا رُخ موڑا جاسکتا ہے۔" مجمع میں سے ایک سائنسدان نے ڈاکٹر نستور کی تائید میں کہا۔"میرے پاس اس کی تھیوری موجود ہے۔"

"تو پھر تم اپنی تھیوری کو جلد از جلد عملی جامہ پہناؤ۔" پروفیسر اس سائنسدان سے مخاطب ہوا۔"ہمارے پاس صرف بیس دن ہیں۔"

"کچھ نہیں ہوسکتا......اب کچھ نہیں ہوسکتا۔" یوسف تشیک چلایا۔لیکن مجمع میں کسی نے بھی اس کی آواز پر دھیان نہیں دیا۔وہ سب نہایت تیزی سے کمرے سے نکل گئے۔

دو دن...... جی ہاں، صرف دو دن میں وہ لوگ ایسی مقناطیسی مشین بنانے میں کامیاب ہو گئے جسے خلاء میں چھوڑ کر کسی بھی سیارہ کو اس کے پیچھے لگایا جا سکتا تھا۔ اللہ نے انہیں شعور کی نعمت سے بے اندازہ نوازا تھا۔

اس مقناطیسی مشین کو نومولود سیارہ کے متبادل خلاء میں بھیجا گیا۔ لیکن ابھی یہ مشین اس سیارہ سے کئی کروڑ میل دور تھی کہ اس سیارہ کی زبردست کشش نے اسے اپنی جانب کھینچ لیا۔

ادارۂ فلکیات کے سائنسدانوں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ ان کے ذہنوں میں کشش کا خیال تک نہ آیا۔ اور اس نومولود سیارہ کی تو کشش بھی حیرت انگیز تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ نظامِ شمسی میں داخل ہونے سے قبل ہی یہ سیارہ پورے کہکشانی نظام کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

یوسف تشیک خوش تھا کہ اب یہ لوگ اللہ کے وجود کے قائل ہو جائیں گے لیکن ان کی مثال تو ''قومِ عاد و ثمود'' جیسی تھی۔ جو کہتے تھے ہم طوفانوں کو روک لیں گے۔''

یہ لوگ اب بھی مادہ کو اپنی عافیت کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس ناکامی کے بعد، پروفیسر نے فوراً ہی اعلان کیا۔

دوستو!......

اب یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ دنیا کا خاتمہ قریب ہے۔ کیوں کہ نومولود سیارہ نہایت برق رفتاری سے نظامِ شمسی کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اس سے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ سوائے اس کے کہ ہم سب زمین کو چھوڑ کر جلد از جلد خلاء

میں نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو جائیں۔

''دوستو! اس مقصد کی خاطر ہم سب کو مل کر جلد از جلد زیادہ سے زیادہ خلائی گاڑیاں تیار کرنا ہوں گی۔''

اعلان سنتے ہی لوگ فیکٹریوں کی جانب دوڑ پڑے۔ میں نے پہلی بار ڈاکٹر نستور کے چہرے پر پریشانی کی لکیریں دیکھیں۔

اب اس سیارہ کی کشش نے نظامِ شمسی پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا تھا۔ سورج میں زبردست آتشیں سیال کی بڑی بڑی لہریں اٹھنے لگی تھیں جن سے نہایت ہی گرم بخارات کے بادل بن رہے تھے اور ان بادلوں سے لاکھوں میل کی فضا متاثر ہو رہی تھی۔

زمین سے سورج کا دس کروڑ میل کا فاصلہ ہے۔ اگر یہ بخارات زمین تک پہنچ جاتے تو ہر شے جل کر بھسم ہو جاتی لیکن اس نومولود سیارہ سے خارج ہونے والی شعاعیں راستہ ہی میں ان بخارات کو جلا کر خاک سیاہ کر دیتی تھیں اور یوں سورج کی لپٹوں سے بننے والے بخارات کے بادل اس کی شعاعوں سے ٹکرا رہے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین کو تباہ کرنے کی خاطر دو عناصر ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

اس کش مکش کے نتیجے میں زمین پر عجیب سی ہل چل مچی ہوئی تھی۔ دریاؤں اور سمندروں میں ہلکے ہلکے طوفان اٹھنے لگے تھے۔ ہریالی متاثر ہو رہی تھی اور کبھی کبھی رات کے وقت چاند بھی دھندلا جاتا تھا۔

☆☆☆

اس دنیا کے لوگوں نے خلائی گاڑیاں بنا بنا کر میدان میں کھڑی کرنا شروع کردیں۔ اور صرف ایک ہفتہ میں یہ گاڑیاں اتنی زیادہ تیار کرلی گئیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا تھا۔

پروفیسر اس سیارہ کے مشاہدے میں مسلسل مصروف تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے آلات نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ خلاء میں بھی ان کے جتنے آلات تھے وہ سب جل چکے تھے جس کی وجہ سے اس سیارہ کی صحیح نقل و حرکت کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ زمینی آلات بھی ناکارہ ہوتے جارہے تھے۔ زلزلہ ناپنے کے آلات بے کار ہوچکے تھے۔ کمپیوٹر سسٹم بھی اسی طرح ناکارہ ہوتا جارہا تھا۔ دوربینوں کے عدسے دھندلا رہے تھے۔

اس کے باوجود انسان سرکشی سے باز آنے کو تیار نہیں تھا۔ مادہ پرست انسان اپنی تمام تر دماغی صلاحیتوں کے باوجود قدرتِ الٰہیہ کے سامنے بالکل مجبور نظر آرہا تھا۔ خالقِ کائنات نے کھربوں نوری سال کے فاصلے سے صرف ایک سیارہ کو اپنی جگہ سے ہلنے کا حکم دیا تھا۔ اور اس سیارہ نے پورے نظامِ شمسی کو درہم برہم کرنا شروع کردیا۔ کتنا مجبور و بے بس ہے انسان!

زمین پر، ایک قیامت برپا تھی۔

فضا میں حرارت بے انتہا بڑھ چکی تھی۔ لوگ گرمی سے پریشان تھے۔ رات کو چاند بھی سورج ہی کی طرح تپنے لگا تھا۔ چاندنی جو ٹھنڈک کی علامت ہے دھوپ کی طرح گرم ہونے لگی تھی۔ دریاؤں اور سمندروں کا پانی بھی خشک ہوتا جا

رہا تھا۔

تمام سائنسی آلات نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ پروفیسر نے لوگوں کو حکم دیا کہ جتنی جلد ممکن ہوسکے وہ خلائی گاڑیوں میں بیٹھ کر پرواز کرجائیں۔

لوگ بے تحاشہ گاڑیوں کی جانب دوڑ رہے تھے وہ سمجھتے تھے کہ ان گاڑیوں میں بیٹھ کر وہ خلاء میں پہنچ جائیں گے...... قدرت ان کی نادانی پر مسکرا رہی تھی۔

اس افراتفری کے عالم میں یوسف تشیک میرا ہاتھ پکڑے دوڑ رہا تھا۔ اور ساتھ ہی کہتا جارہا تھا کہ اگر یہ لوگ وجودِ الٰہی کے منکر نہ ہوتے تو آج اس عذاب کے سزاوار قرار نہ پاتے۔ اللہ نے انسان کو اشرف المخلوقات اس لئے بنایا ہے کہ وہ عقل و دانش سے کام لے کر اس کا شکر گزار بندہ بن جائے۔ اشرف المخلوقات اس لئے نہیں بنایا کہ وہ اللہ ہی سے ٹکرانے کی سوچنے لگے۔

میں اسے کیا جواب دیتا۔ وہ جو کچھ بھی کہہ رہا تھا سچ تھا۔

ہم دونوں لوگوں کے درمیان راستہ بناتے ہوئے بھاگے جارہے تھے۔

''اللہ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے جو پیغام بھیجا۔ وہ سب انسان کی بھلائی کے لئے ہے۔'' یوسف تشیک نے دوبارہ کہا۔ ''اللہ کے حکم پر جو بندہ بھی عمل کرتا ہے اس میں ضرور بھلائی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر کی سنت اور حکمِ الٰہیہ میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اب یہی دیکھ لو......''

اتنا کہہ کر وہ ایک دم رُک گیا اور مجھے بھی اس نے روک لیا۔

میں نے غور سے چاروں جانب نظر دوڑائی۔ میرے اطراف میں لوگ کھلے سر احرام باندھے صفا اور مروہ کی پہاڑی کے درمیان بھاگ رہے تھے۔

''...... یاالٰہی! یہ کیاماجرا ہے!'' میں نے حیرت واستعجاب کے عالم میں سوچااور پھرنظریں اٹھا کرچینی یوسف تشیک کی طرف دیکھنے لگا...... لیکن، وہ...... وہ تو دُور، بہت دُور، حاجیوں کے ہجوم میں بھاگا جارہاتھا......

اور اب...... نہ تو جزیرہ تھااور نہ ہی وہ لوگ تھے...... بلکہ میں خود حاجیوں کے درمیان کھڑاتھا...... حیران...... میں سوچ رہاتھا کہ میں نے شاید کوئی خواب دیکھا ہے،جس کی تعبیر میں مستقبل کی نشاندہی کی گئی ہے۔یا کیا؟

قارئین......!

یہ داستان جوابھی ابھی آپ نے پڑھی ہے آج سے پینتیس چھتیس سال قبل ایک دوست نے سنائی تھی جوحج کرنے کی غرض سے سعودی عرب گئے تھے۔وہیں ان کی ملاقات اپنے ایک رشتہ دار سے ہوئی جو طائف میں رہتے تھے۔اور یہ واقعات ان کے بھانجے کوپیش آئے تھے۔

بھانجے کا کہنا ہے کہ چینی مسافر یوسف تشیک سے اس کی ملاقات یونانی جہاز پرہوئی تھی اورتمام واقعات جو یہاں بیان کئے گئے ہیں بحالتِ ہوش وحواس اس کے ساتھ گزرے ہیں۔

جب کہ ان کے ماموں کا کہنا ہے کہ وہ چینی مسلمان یوسف تشیک ان کا دوست تھا اس نے مذہب کے ساتھ ساتھ اپنے وطن کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے

خیر باد کہہ دیا تھااور مسلمان ہوکر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سعودی عرب چلا آیا تھا۔وہ کبھی کبھی طائف بھی آیا کرتا تھا۔اوراکثر مادّہ پرست لوگوں میں رُوحانیت کی تبلیغ کیا کرتا تھا۔ان واقعات کے بعد پھر کبھی وہ طائف نہیں آیا۔خدا جانے کہاں چلا گیا۔

قارئین......!

آپ فیصلہ کریں کہ اگر یہ خواب تھاتویوسف تشیک کون تھاجو کبھی کبھی طائف بھی آیا کرتا تھا۔

☆☆☆